حسب اجازت مصنف

جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے
دماغ عشق ہم کو بھی کبھو تھا
(میر)

خواب و خیال

(اور)

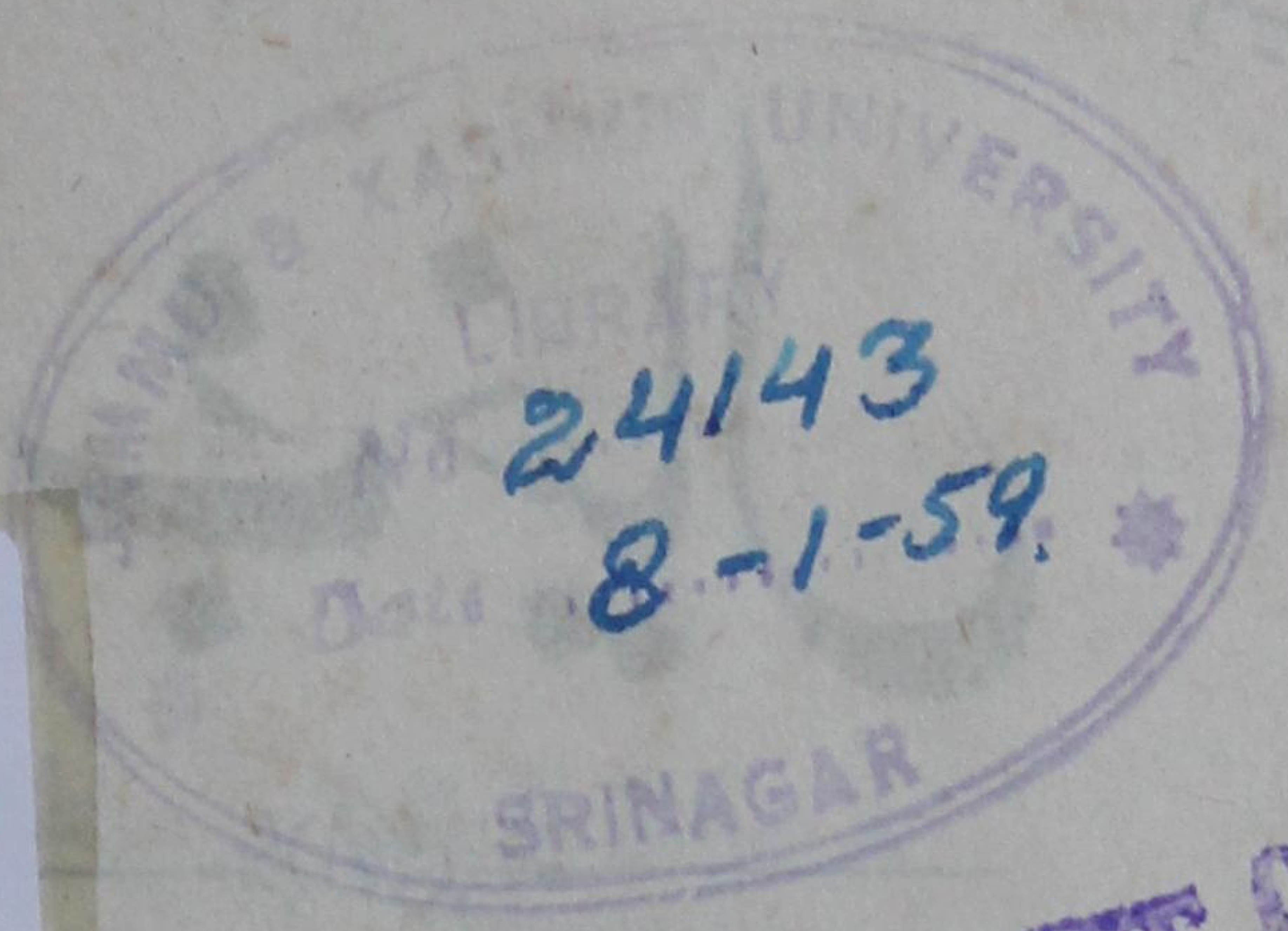
دوسرے افسانے

(از)

مجنوں گورکھپوری

منیجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے
یونائیٹڈ انڈیا پریس نیا گاؤں لکھنؤ
میں باہتمام سید توسل حسین چھپوا کر شائع کیا
سنہ ۱۹۴۳ء
بار دوم ۲۰۰۰ جلد
قیمت




JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No. 24143
8-1-59
Date
SRINAGAR

فہرست

انتساب

اے شاہد شاہداں سلامت — اے کعبۂ عاشقاں سلامت
اے جانِ جہانِ دلربائی — اے روحِ روانِ آشنائی
اک عالمِ نو مجھے دکھایا — تو نے مجھے کیا سے کیا بنایا
تو نے مجھے رنج میں خوشی دی — تو نے مجھے تازہ زندگی دی
چمکا دیا روشنی نے تیری — دنیا مری ورنہ تھی اندھیری

موجوں کا تھا ہر طرف تھپیڑا — طوفان میں روح کا تھا بیڑا
دم گھٹ ہی رہا تھا بحرِ غم میں — بس ڈوب چلا تھا کوئی دم میں
تو نے منجدھار سے بچایا — تو نے مجھے گھاٹ پر لگایا

اے میکدۂ نشاط و مستی — اے قبلۂ دینِ مے پرستی
دیکھیں تو کہاں ہیں ہوش والے — آنکھیں ہیں کہ مدھ بھرے پیالے
لب ہیں کہ دکانِ مے فروشی — دیتے ہیں صلائے بادہ نوشی

اللہ رے زلف و رُخ کا منظر
گھنگھور گھٹا ہے آسماں پر

انگڑائی میں یہ قدِ سہی ہے
یا موجِ شراب اُٹھ رہی ہے

وقفِ الم مدام تھا میں
جینے سے تلخکام تھا میں

تو نے اک جام میں چھلکایا
دل سے غمِ دو جہاں بُھلایا

اے ساقیِ مہرباں سلامت
اے خواجۂ تشنگاں سلامت

اے مایۂ راحت و صبوری
اے غیرتِ قرب تیری دوری

ہر چند کہ تجھ سے دور ہوں میں
ہر لحظہ ترے حضور ہوں میں

تو دل میں رہے سرور بن کر
آنکھوں میں بسے ہے تو نور بن کر

ہے پیشِ نظر جمال تیرا
ہر دم ہے مجھے خیال تیرا

تیرا ہی ظہور چار سو ہے
اب میری نظر میں تو ہی تو ہے

بلبل کی چہک میں ساز تیرا
پھولوں کی مہک میں راز تیرا

تو نغمۂ آبشار میں ہے
تو وادی و کوہسار میں ہے

جنگل میں برگ و بار تو ہے
شادابیِ مرغزار تو ہے

دریا میں ہے موج کی روانی
جل تھل کی ہے تجھ سے زندگانی

تجھ سے یہ جہانِ رنگ و بو ہے
ہر آن تو میرے روبرو ہے



خورشیدِ سحر میں نور تیرا — تو ہی ہے رات کا اندھیرا

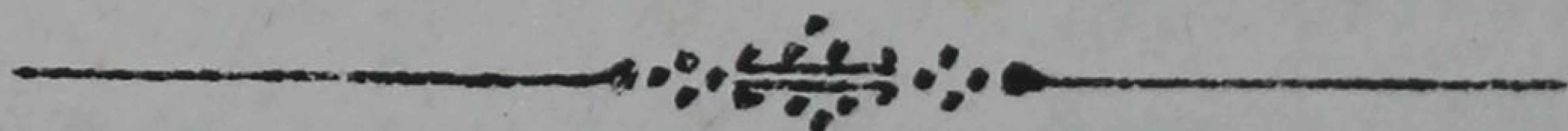
اے روحِ روانِ نور و ظلمت — میرے لئے زندگی کی جنت

آنکھوں کو جس طرف اُٹھایا — کچھ تیرے سوا نظر نہ آیا

اے تو کہ ہے شش جہت پہ چھائی — مجھ میں بھی تری ہوا سمائی

ہر بات مری ترا فسانہ
ہر سانس مری ترا ترانہ

مجنوں



تم

تم کون ہو؟ خیر تم کوئی بھی ہو، تمھیں کچھ اسکا بھی ہوش ہے کہ یہ
سب تمھارا ایک دلکش اور روح فریب خواب ہے؟ ہاں تم اور تمھاری
نت نئی ادائیں سب خواب ہیں۔ تمھارا ایک ایک قدم تمھاری ایک ایک
سانس خواب ہے۔ تم جن چیزوں کو پائدار اور حقیقت ہستی سے تعبیر کرتی ہو
وہ دیکھتے دیکھتے اسی طرح فنا ہو جانے والی ہیں جس طرح پانی کی سطح پر
پل مارتے بلبلے ٹوٹ جاتے ہیں تمھاری کامیابیاں اور تمھاری محرومیاں تمھارا رونا
اور تمھارا ہنسنا، تمھاری دانائیاں اور تمھاری نادانیاں، تمھاری اچھائیاں
اور تمھاری برائیاں، مختصر یہ کہ زندگی کا یہ سارا کھٹراگ بہت جلد تمھارا
ساتھ چھوڑ کر برباد ہو جانے والا ہے۔ اس وقت میں تمھاری ہستی کو
اس کی اصلی ہیئت میں دیکھ رہا ہوں۔ جب کہ وہ ہر فانی نقش سے معرّا
اور ہر اعتباری رنگ سے بے نیاز ہو چکی ہے جب کہ بادشاہی اور
گداگری، رنج و راحت، یاس و امید، کامیابی اور ناکامی، شکم سیری

اور فاقہ مستی، لینا دینا، مرنا جینا، اس کے لئے نہ صرف غیر مانوس بلکہ بے معنی اصطلاحیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ تم جو کوئی بھی ہو میں تم کو اپنے الہامات شعری کا وسیلہ بناتا ہوں۔ اپنے کان میرے ہونٹوں کے قریب لاؤ۔ سنو! میں زیر لب کیا کہہ رہا ہوں۔ میری روح اپنے مدھم سُروں میں کون سا راگ چھیڑے ہوئے ہے۔ میں نہ جانے اب تک کتنے مردوں اور عورتوں سے محبت کر چکا ہوں۔ دنیا کو نہ جانے کتنی بار عاشقی کا دھوکا دے چکا ہوں۔ لیکن یہ کیا؟ میں نے ان میں سے کسی کے ساتھ ان کیفیتوں کو محسوس نہیں کیا۔

اللہ اللہ! میں نے بھی کہاں کہاں کی خاک چھانی، کتنے آستانوں کی ٹھوکریں کھائیں۔ مگر مجھے وہ نامعلوم چیز نہ ملی جس کی مجھے جستجو تھی۔ فطرت کی طرف سے میں . . . . اپنے اندر ایک نہایت پُرخروش جذبۂ عبودیت لایا تھا۔ کسی در کی خاک اس کو آسودہ نہ کر سکی۔ میرے ہیجان و اضطراب کا اندازہ میرے اس شعر سے کرو۔

سرِ نیاز ہے جھکنے کے واسطے بیتاب
مگر مجھے تو کوئی آستاں نہیں ملتا

میرا ذوقِ پرستش میرے اندر مردہ ہو چلا تھا اور آخر کار میں نے تم کو پالیا اس حالت میں کہ تمہارا پیکرِ خاکی میری دسترس سے باہر ہے مگر مجھے

اس کا رنج کیوں ہو؟ تم میں جتنے لطیف عناصر ہیں وہ میرے ہیں،
میرے ہیں اور کسی کے نہیں۔ تم جس کو اپنی ہستی سمجھ رہی ہو وہ فانی ہے
اور ساعت بساعت اپنی فانیت کا پردہ فاش کر رہی ہے۔ وہ دم
بہ دم مٹ رہی ہے۔ میرے لئے وہ مٹ چکی ہے۔ خود میری ہستی
مٹ رہی ہے اور میں اس کو مٹا رہا ہوں۔ ہاں تو آؤ میری سرسوتی بہ
کاش اس سے پہلے میں نے تم کو پالیا ہوتا پھر میں دنیا اور دنیا کی
تمام نیرنگیوں سے منھ موڑ لیتا اور تمہارے مندر کا پجاری بن کر بیٹھ رہتا۔
اب میں زندگی کے تمام شور و شر کو تج دوں گا اور تمہارے بھجن گاتا
رہوں گا۔ تم کو اور تمہاری ماہیت کو دنیا میں کسی نے نہیں سمجھا۔ خود
تم نے نہیں سمجھا۔ لیکن میں نے خوب سمجھ لیا ہے۔ جس نگاہ سے میں
نے تمھیں دیکھا کاش اُسی نگاہ سے تم نے بھی اپنے کو دیکھا ہوتا۔ دنیا
میں ہر آدمی تم میں کوئی نہ کوئی نقص بتا دے گا، ایک میں ہوں کہ تم کو
منتہائے کمال سمجھتا ہوں۔ تم کو جو دیکھے گا وہ تمہارا گرویدہ ہو کر تم کو
حاصل کرنا اور تم پر قابو پانا چاہے گا۔ انسان بھی کیسا مکار جانور ہے۔ عشق
کتنا زبردست فریب نفس ہے! ذرا دیکھنا! جس کی غلامی کا انسان دم
بھرتا ہے اُسی کا مالک بھی بننا چاہتا ہے۔ مگر میں تم کو کسی کے قابو میں
نہیں دیکھنا چاہتا۔ میرے دل میں کبھی یہ تمنا نہیں پیدا ہوئی کہ تمہارا مالک

بنوں۔ میں کسی قوت کو تم سے برتر نہیں پاتا اور کیوں، یہ تو کفر ہوگا؟ میں تمہیں کو تمہارا خدا سمجھتا ہوں۔ دنیا کے بڑے بڑے نقاشوں نے جتنے نقش اُتارے ہیں، بُت سازوں نے جتنے بت تیار کئے ہیں، اکابر شعرا نے جتنے سراپا لکھے ہیں وہ سب اس وقت گویا میرے سامنے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی تمہارے سامنے ٹھہرنے کی تاب نہیں لاتا۔ تم میں حُسن کے وہ نکات ہیں جن کا اظہار نہ موسیقی میں ممکن ہے نہ شعر میں، ان کی نمائش نہ کسی نقش میں کی جا سکتی ہے نہ کسی مجسمہ میں۔ زیادہ سے زیادہ ان کو خسرو کی الہامی زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے :-

صورت گرِ نقاش چیں رو صورتِ یارم ببیں
یا صورتے کش ایں چنیں یا ترک کن صورت گری

لیکن آخر تم کیا ہو؟ کبھی تم نے بھی سوچا؟ تم نے اپنے کو جاننے پہچاننے کی کوشش نہیں کی، تمہارا حُسن گوشت پوست میں نہیں ہے۔ یہ کوئی خلاف امید بات نہ ہوگی۔ اگر دنیا میں تم سے زیادہ سڈول بدن، تم سے زیادہ دلپذیر صورتیں نکل آئیں، مگر تمہارے حُسن کا راز کہیں اور ہے۔ ورنہ آج جب کہ زمانہ تم سے بیوفائی کر رہا ہے، دنیا تم سے مفارقت پر تُلی ہوئی ہے، زندگی تم کو منھ چڑھا رہی ہے، اور موت تمہارے سر پر کھیل رہی ہے، آج جب کہ تم ڈوب رہی ہو اور تمہارا جگت ڈوب رہا ہے،

تمہارے حسن اور میری محبت کو بھی ڈوب جانا چاہیئے، مگر نہیں۔ میں ان بیمار ہڈیوں کے ڈھانچ میں ان بے رنگ اور پژمردہ چہرہ میں ان تپ زدہ ہونٹوں میں، ان رحم طلب اور مایوس آنکھوں میں اس "حقیقت" کو تمام رعنائیوں اور نیرنگیوں کے ساتھ عریاں دیکھ رہا ہوں جس کو "میں" تم کہتا ہوں۔ نہیں! تمہارا یہ عنصری نقاب تم کو مجھ سے چھپا نہیں سکتا "حسن لیلیٰ" کو "حسن ازل" نے اپنے "رخسار" کا عکس بنایا۔ میں "حسن ازل" کو تمہارا دوسرا نام سمجھتا ہوں، نہ تم فانی، نہ تمہارا حسن فانی اور نہ میری محبت فانی۔

اگر دریا کی روانی کبھی رک نہیں سکتی، اگر مشرق و مغرب کی رنگینیوں کو کبھی زوال نہیں، اگر چاند، سورج اور تاروں کی دنیا بس ہمیشہ آباد رہیں گی اگر صبح و شام کی گردشیں یوں ہی برابر جاری رہیں گی، اگر بہار و خزاں یونہی سدا روپ بھرتے رہیں گے تو مجھے اطمینان ہے کہ تم بھی انھیں میں کہیں نہ کہیں ہو گی۔ بلکہ میرا ایمان تو یہ ہے کہ یہ سب ہوں یا نہ ہوں تم ضرور ہو گی اور تمہارا پجاری ہونے کی حیثیت سے میں بھی ہوں گا۔

اب سے پہلے میں زندگی کو آنی و فانی سمجھتا تھا۔ میرے خیال میں زندگی کیا تھی قدرت کا ایک اندھیر تھا۔ مگر تم کو دیکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ خدا کیا ہے۔ زندگی کی اصلیت کیا ہے اور میں کیا ہوں یقین مانو اس سے پہلے کبھی میں نے خلوص کے ساتھ خدا کا نام نہیں لیا تھا۔ تم نے میرے اندر

دبے ہوئے میلانات کو اُبھار دیا۔ زندگی کا راز مجھے تم سے معلوم ہوا جھوٹ سے میرا منھ تم نے موڑا۔ حق شناسی کی دولت مجھے تم نے دی۔ میرا قلم چل رہا ہے اور تم میرے سامنے ہو، گویا یہ الہامات ہیں تمھاری طرف سے۔

لوگ کہتے ہیں کہ تم بستر مرگ پر ہو۔ سب تمھاری سانسیں گن رہے ہیں۔ شاید کل کی صبح تمھاری سانسوں سے محروم ہو جائے۔ لیکن یہ سب باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ لوگ کچھ کہتے ہیں اور میں سنتا ہوں۔ لیکن یہ سب لغو اور لاطائل بکواس معلوم ہوتی ہے۔ میں تو تم کو رعنائی اور بالیدگی سے معمور دیکھ رہا ہوں۔ تم تو نشاط و نمو کا وہ ازلی اور قدیم سوتا ہو جہاں سے کائنات کا ذرہ ذرہ حسب استعداد اپنا سرمایۂ حیات حاصل کرتا ہے پھر یہ کیا کہا جا رہا ہے کہ تم دو چار دن کی مہمان ہو۔

ناچار مسلماں شو

کچھ اپنے متعلق

۱

میرے ایک انگریز پروفیسر اکثر حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے۔ "بچپن سے مجھے حوصلہ تھا کہ میں بحری قزاق ہوں اور میں بچپن سے اپنے کو اس نصب العین کے لئے تیار بھی کر رہا تھا۔ لیکن زمانہ جس کو جو چاہے بنا دے میں آج پروفیسر ہوں اور تم لوگوں کو منطق اور نفسیات پڑھاتا ہوں اور ان علوم میں ماہر سمجھا جاتا ہوں۔ مگر سچ پوچھو تو آج تک وہ بچپن کی حسرت دل میں باقی ہے۔"

آج میں اپنے افسانوں کے مجموعہ کے لئے دیباچہ لکھ رہا ہوں اور مجھے بے طرح اپنے استاد کا وہ قول یاد آرہا ہے۔ بے شک زمانہ جس کو جو چاہے بنا دے، اور آپ کو مجبوراً وہی بننا ہے جو زمانہ آپ کو بنائے اور ہنسی خوشی وہی رہنا ہے۔

کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو

(۲)

میں بچپن سے لیکر اب تک کی زندگی پر بیٹھ کر غور کرتا ہوں تو کتنی آرزوؤں کا ماتم کرنا پڑتا ہے جو دل ہی دل میں خون ہو کر رہ گئی ہیں۔ میں بھی نہ جانے کیا کیا ہونا چاہتا تھا۔ میں بھی نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھ چکا ہوں۔ سب سے پہلے اس نقش پذیر سن طفولیت کو لیجئے جب کہ قدم قدم پر معیار بدلتا ہے اور گھڑی گھڑی خیالات کا مرکز ہٹتا ہے۔ اس دور کی بھی باتیں مجھے کل کی طرح یاد ہیں، وہ دن مجھے بھولا نہیں جب کہ "آرائش محفل" پڑھنے کے بعد میرے دل میں بھی "حاتم طائی" بننے کا حوصلہ پیدا ہوا تھا اور پھر عرصہ تک اپنے دل میں یہی نیت کئے رہا کہ.... حاتم کی طرح میں بھی دنیا کی سیر و سیاحت کروں گا اور خلق اللہ کے کام آؤں گا اس کے بعد حاتم کی جگہ سندباد نے لی۔ کچھ اور آگے بڑھا تو شاہزادہ احمد پر رشک آنے لگا اور پری بانو کے خواب دیکھنے لگا۔ یہ جوانی دیوانی کی ابتدا تھی۔ جس کی ابتدا عموماً عشق سے ہوا کرتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میری جوانی کی ابتدا واقعۃً عشق سے ہوئی یا نہیں ؟ ابھی حال میں ایک صاحب یا صاحبہ نے میری ہجو یا تعریف میں ایک مبسوط مضمون لکھا ہے جس میں جہاں بجا و بیجا اور بہت سی جھوٹ سچ تہمتیں لگائی گئی ہیں وہاں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے

کہ مجھے عشق کی ہوا بھی نہیں لگی ہے" میں ان کی اور اپنی دونوں کی خاطر سے یہ دعویٰ تسلیم کئے لیتا ہوں۔ مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پریوں کے خواب میں نے بھی دیکھے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب یہ کہنے کے قابل ہوں کہ:-

"نہ دماغ میں وہ جنوں رہا نہ خیال میں وہ پری رہی"

زمانہ مجھ پر بھی فتح پا گیا۔ اس کا جتنا رونا روئیے کم ہے۔

میری زندگی کا تعلیمی دور آیا۔ میں بہت جلد جوانی اور جوانی کی شورشوں سے اُکتا سا گیا اور علم وادب کی دنیا میں کھو گیا جو محض ناکاروں کی دنیا ہے جو زندگی میں کوئی کام کرنا نہ چاہتا ہو جو زندگی کی جانگسل آزمائشوں سے پناہ مانگتا ہو وہ اس دنیا میں آکر پناہ لے۔ بڑے مزے کی دنیا ہے اور یہاں ہر طرح کے "نامردوں" کا نباہ خوب ہوتا ہے۔

لیکن اس دور میں بھی مجھے کچھ کم مغالطے نہیں ہوئے اور "میں کون ہوں کیا ہوں"۔ نے ایک مدت تک مجھے حیران و سرگرداں رکھا۔ بہت دنوں تک تو مجھے یہ زعم تھا کہ میرا دماغ سائنس کے لئے موزوں ہے اور مجھے اپنی "فکر رسا" سے سائنس کے "علوم متعارفہ" میں اضافہ کرنا چاہیئے اس دھن میں کچھ دنوں تک کیمیا، طبیعیات، حیاتیات اور ریاضیات میں سر کھپاتا رہا لیکن بہت جلد میری فطرت نے مجھ سے بغاوت شروع کی

اور مجھے ان علوم کی بے مائگی معلوم ہوگئی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ "یہ سب سطحی باتیں ہیں۔ اب میرا رجحان اور موضوعات کی طرف ہوا۔ کبھی منطق اور اقتصادیات پڑھی، کبھی تواریخ و فارسی پڑھی۔ کبھی کچھ پڑھا، کبھی کچھ پڑھا اور اس طرح چھ برس تک محض ایف، اے کی سیر کرتا رہا۔ مگر کسی کروٹ مجھے چین نہیں ملا۔ آخر کار فلسفہ اور ادبیات میں آکر پابدامن بیٹھ گیا۔ اسکی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اب اس سے زیادہ "جنون جولانی" کی تاب مجھ میں باقی نہیں تھی، اور میں اپنی "ہردم خیالی" سے تنگ آچکا تھا لیکن ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس دوران میں میری شادی ہو چکی تھی اور بیوی بچوں نے سمجھا دیا تھا کہ "ہمارے ہوتے ہوئے تم کو حق کیا ہے کہ کسی اور مسئلہ پہ غور کرو"۔ مولانائے روم نے اپنے تجربات کی بنا پہ کہا ہے:۔

"چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن"

میرا تجربہ مجھے یہ بتاتا ہے کہ اگر "دنیا" نام ہے صرف خدا سے غافل ہونے کا تو وہ سرتاسر "قماش و نقرہ و فرزند و زن" پہ مشتمل ہے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر کسی کو "بیوی بچوں" کی علت لاحق ہو جائے تو اس کو نہ صرف یہ حق حاصل ہے بلکہ اُس کا فرض ہے کہ وہ "اپنے خدا" کو بھول جائے جس سے کہیں مرنے کے بعد نپٹنا ہوگا۔ انسان کی زندگی کیا ہے؟ اسکی ماہیت اور

غایت کیا ہے؟ خیر و شر کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ حُسن کس کو کہتے ہیں اور قبح کس چیز کا نام ہے؟ اعمال حسنہ کس کو کہتے ہیں اور حیات بعد الممات میں ہمارے اعمال کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یا حیات بعد الممات کوئی چیز ہے بھی یا نہیں؟ روح کی اصلیت کیا ہے؟ اور مادہ اور روح میں کیا فرق ہے؟ یہ وہ مسائل ہیں جن پر اب سے چند سال پہلے میں نے بھی نہ جانے کتنی دماغ سوزی کی ہے، ساری ساری رات انھیں مسائل کی اُدھیڑ بن میں گزر جاتی تھی مگر بیوی بچوں نے آکر میری ساری "آسمان نوردی" بھلادی اور مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ "شکم پروری" اور "ستر پوشی" کی فکر کرو، اور بیوی و فرزند کے کام آؤ۔ یہی اپنی خدمت ہے، یہی ملک و قوم کی خدمت ہے۔ یہی خدا اور رسول کی خدمت ہے۔ چنانچہ اب ایک مدت ہوگئی کہ "غم روزگار" ہی میں بسر ہو رہی ہے۔ "عاقبت کی خبر خدا جانے۔"

۳

اہل و عیال کے علاوہ اگر میری اب تک کوئی مصروفیت رہی ہے تو وہ مطالعہ ہے۔ میں واقعی "وسیع مطالعہ" رکھنے والا جانور ہوں جیسا کہ میرے نقاد کا خیال ہے۔ میں نے کتابیں کثرت سے پڑھی ہیں، اور بلا امتیاز و تفریق پڑھی ہیں۔ خرافیات، مذہب، تاریخ، اقتصادیات، سیاسیات، سائنس و فلسفہ، ادبیات، علم الامراض۔ غرض کہ کون سی ایسی

چیز ہے جس میں مجھے تھوڑا بہت دخل نہ ہو، اور فلسفہ و ادبیات کا تو خاصا چسکا ہے۔ ایسے افکار و آلام کی زندگی میں بھی رات کے وقت جب کہ دنیا کی ہر فکر سے کسی قدر آزاد رہتا ہوں تو یقین مانئے کبھی شبلی کی نظمیں کبھی سویڈنبرگ کے الہامات اور کبھی کروچے کے جمالیات اور کبھی بریڈلے کی "مجاز و حقیقت" ہی کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ آپ میری ذہانت اور وسعت مطالعہ کی داد دیجئے اور مجھے اپنے سے بلند و برتر سمجھئے نہیں! یقین مانئے نہیں! میں تو اُن لوگوں میں سے ہوں جو صرف اس لئے لکھتے پڑھتے اور اپنا وقت ضائع کرتے ہیں کہ ان کو دنیا کا کوئی اور کام کرنا نہیں آتا جو لکھتے پڑھتے اسی طرح ہیں جس طرح لوگ شراب، سگریٹ یا افیون سے اپنا وقت کاٹتے رہتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اور لوگوں کو صاحب قلم ہونے کا کیوں ارمان ہوتا ہے۔ میں تو جو کچھ لکھتا پڑھتا ہوں وہ صرف اس لئے کہ میں کوئی اور کام کر ہی نہیں سکتا اور مجھے لکھنے پڑھنے کی ایک بُری عادت سی ہو گئی ہے یعنی میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو صرف علم و ادب میں اپنی زندگی کے دن گزار سکتے ہیں اور گزار دیتے ہیں۔

ہاں تو میں مضمون (اور بالخصوص افسانہ) لکھتا ہوں اس طرح جس طرح آپ لوگوں میں سے اکثر حضرات دس بجتے ہی دفتر جانے کی تیاری کرنے

لگتے ہیں۔ مجھے آپ لوگوں نے فسانہ نگار سمجھ رکھا ہے اور آپ لوگوں نے جو کچھ سمجھ رکھا ہے اُس کی لاج رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

(۴)

مجھے اکثر لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں افسانہ نگار ہوں، اور اچھے افسانے لکھتا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ رائے کہاں تک صحیح ہے مجھے تو آج تک اپنے کو افسانہ نگار ماننے میں تامّل ہے۔ میرا سب سے پہلا افسانہ یقیناً "زیدی کا حشر" ہے اور اس کو میں نے ایک دوست کی تحریک سے لکھا اور یہ دوست ایک عورت تھی جو نیاز صاحب کے فسانہ "شہاب کی سرگزشت" سے بہت مرعوب تھی۔ میری رائے اس افسانہ کے متعلق کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ اس افسانہ میں مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس کا مجھ پر کوئی اثر ہوتا۔ میں نے اس کو محض لکھنے والے کے غلط پندار کا مرقع پایا۔ اس سے مراد نیاز صاحب کی تنقیص نہیں ہے۔ لیکن مجھے ان کا یہ فسانہ بے معنی اور بے نتیجہ معلوم ہوا۔ جب میں نے اپنی رائے کا اُس عورت سے اظہار کیا تو شاید وہ اس کی متحمل نہ ہوسکی اور مجھ سے کہنے لگی:۔

"یہ سب نہ لکھ سکنے کی تاویلیں ہیں، میں جب جانوں کہ آپ بھی کوئی ایسا ہی بے نتیجہ فسانہ لکھ دیں"۔

میں نے کہا۔ "بیگم! میں اس سے زیادہ مہمل اور لاطائل فسانہ بھی لکھ سکتا ہوں"۔ اور اسی دن "زیدی کا حشر" چھیڑ دیا۔ نصف لکھ چکا تھا کہ نیاز صاحب گورکھپور تشریف لائے۔ انھوں نے اس کو دیکھ لیا اور جسقدر مسودہ لکھا تیار تھا اُس کو زبردستی لیکر بھوپال چل دئے اور فوراً اسکی کتابت شروع کرادی۔ اب میں بُرے بھلے "زیدی کا حشر" مکمل کرنے پر مجبور تھا چنانچہ "زیدی کا حشر" مکمل چھپا اور بہتیروں نے اس کو پسند کیا لیکن یہ بھی سنئے کہ خود میری نگاہوں میں اس کی کیا وقعت ہے۔ میں شروع سے آخر تک اس کو پڑھتا ہوں تو مجھے بڑی ہنسی آتی ہے۔ مجھے اسکو اپنے نام سے منسوب کرتے ہوئے بھی شرم معلوم ہوتی ہے اور میری خواہش اور میری وصیت یہ ہے کہ جب کبھی میرے تمام فسانوں کا مجموعہ یکجا شائع ہو تو اس کو اس مجموعہ میں نہ شامل کیا جائے۔ پڑھنے والوں کو مجھ سے زیادہ سے زیادہ یہ شکایت ہے کہ میں نے ایسی ادق اور مغلق زبان کیوں لکھی۔ مجھے خود اپنی ذات سے یہ شکایت ہے کہ میں نے ایسا افسانہ کیوں لکھا جس کے کسی پہلو سے کوئی معنی ہی نہیں نکلتے۔ اس قسم کی چیزیں محض اعصاب کے ایک غیر معمولی تناؤ کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں اور اس لئے عموماً بے نتیجہ ہوتی ہیں۔

اسی دوران میں نیاز صاحب نے مجھے اصرار کے ساتھ یہ سمجھانا

شروع کیا کہ میرے اندر فسانہ نگاری کا ملکہ بدرجۂ اتم موجود ہے جس کو مجھے کام میں لانا چاہیئے۔ میں دوسرے حوصلے رکھتا تھا، میرا ذاتی رجحان فلسفہ اور تنقید کی طرف تھا۔ لیکن ایک طرف تو نیاز صاحب نے دوسری طرف عوام کی روش نے مجھے فسانہ نگاری یا "فسانہ طرازی" کی طرف مائل کر دیا میں جب کبھی کوئی علمی یا تنقیدی مضمون لکھتا تھا تو رسالے اُسکو بلا معاوضہ ہی شائع کرنے کے لئے تیار ہوتے تھے اور میں اس کے لئے تیار نہ تھا میں نے اپنی عمر عزیز کا زیادہ تر حصہ انھیں کاہلانہ مشاغل میں صرف کیا پھر اس کی کوئی اُجرت نہ ملنا کیا معنی؟ برخلاف اس کے جب کبھی میں فسانہ لکھتا تھا تو مجھے اس کا معاوضہ ملتا تھا اور میری محنت ٹھکانے لگ جاتی تھی، آخر کار میں نے تہیہ کر لیا کہ صرف فسانے لکھوں گا اور اب تک زیادہ تر فسانے لکھے۔ ایوان اشاعت کے قیام سے پہلے شاذ و نادر ہی میں نے فسانہ کے علاوہ کچھ لکھا ہو۔ البتہ کچھ دنوں تک رسالہ "جن" کے سلسلہ میں چند مضامین لکھے ہیں جن کو علمی مضامین کے تحت میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ مجھے فسانہ نگار آپ لوگوں نے بنایا جسطرح کسی بیچارہ کو ایک بادشاہ کے درباریوں نے مار مار کر حکیم بنا دیا تھا اور حاضر دربار کیا تھا۔ اب اگر اس زبردستی کی "حکیمی" کی شرم رہ جائے تو زہے قسمت۔ اس تمام ہرزہ سرائی کا مطلب یہ تھا کہ افسان کا

نصب العین کچھ اور ہوتا ہے اور زمانہ یا ماحول اُس کو لیجاتا ہے کسی اور طرف

۵

میں یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ میرے تمام فسانے طبعزاد ہوتے ہیں لیکن ان افسانوں کے علاوہ جن کو میں نے خاص طور سے ہارڈی کے فسانے سامنے رکھ کر لکھے ہیں میرا کوئی فسانہ کسی خاص فسانہ سے ماخوذ بھی نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ جن فسانوں کے لئے دوسروں کا ممنون ہوں وہ "سُمن پوش" "جشن عروسی" "مدفن تمنا" اور "بیگانہ" ہیں لیکن ان کے متعلق بھی میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ کون فسانہ کہاں سے لیا گیا ہے۔ میں نے فسانے بیشمار پڑھے ہیں اور ان میں سے سیکڑوں میرے ذہن میں منقش ہو کر رہ گئے ہیں جو وقتاً فوقتاً ذاتی تجربات و تاثرات کے اضافہ کے ساتھ اُبھرتے ہیں اور میں ان کو لکھ ڈالتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ماخذ و ماخوذ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر "ہتیا" لیجئے۔ مجھے یاد ہے کہ اس کو میں نے ہارڈی کا TESS پڑھنے کے بعد لکھا تھا لیکن اس میں بہت سے اہم اجزا ایسے ہیں جو یقیناً اپنے مشاہدات و محسوسات کا نتیجہ ہیں چنانچہ جب یہ فسانہ مکمل ہوا تو مجھے خود اس کو TESS کا نقش ثانی کہنے میں تامل تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں جہاں اور بہت سے تجربات و مشاہدات ہیں وہاں TESS کے مطالعہ کے آثار بھی نمایاں

ہیں۔ آپ میرے ہر ماخوذ فسانہ کو (بہ استثنائے "جشنِ عروسی") ایسا ہی پائینگے
ہاں ان افسانوں کو بھی جن کے متعلق میں بتا چکا ہوں کہ ہارڈی سے ماخوذ
ہیں۔ اسی سلسلہ میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا جب میرا افسانہ "گہنا"
نگار میں چھپا تو ایک تبصرہ نگار نے لکھا کہ یہ فسانہ منشی پریم چند کے ہندی افسانہ
"بھوشن" سے بلا حوالہ دئے ہوئے لیا گیا ہے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ خدا جانے
میرے دوست پریم چند کو کچھ لطف آیا یا نہیں۔ "گہنا" کا پلاٹ دراصل میرے
عزیز دوست پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے کا تیار کیا ہوا ہے ایک
دن بیٹھے بیٹھے اُن کے ذہن میں یہ پلاٹ آگیا۔ انھوں نے مجھ سے بھی اس کا
ذکر کیا اور پریم چند سے بھی اور دونوں سے کہا کہ اس قسم کا ایک فسانہ لکھنا چاہئے
پریم چند کو فرصت تھی اُنھوں نے مجھ سے کچھ پہلے ہندی میں لکھ ڈالا لیکن
آج تک مجھے نہیں معلوم کہ میرے فسانہ اور اُن کے فسانہ کے ڈھانچے
کہاں تک مشابہ ہیں۔ اور وہ مجھ سے کس حد تک زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔
اس مجموعہ میں جتنے فسانے ہیں ان میں "خواب و خیال"۔ "شکست
بے صدا"۔ "محبت کی قربانیاں" طبعزاد ہیں۔ باقی کہیں نہ کہیں سے
ماخوذ ہیں۔ "گوہر محبت" ایچ جی ویلس کے ایک فسانہ سے لیا گیا ہے
لیکن اس میں جتنی تعبیریں ہیں وہ سب اپنی ہیں۔

---

(۶)

میرے پاس اکثر ایسے خطوط آتے رہتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ میں فسانوں میں جو کچھ لکھتا ہوں اُس کو میرے پڑھنے والے میری آپ بیتی یا رام کہانی سمجھتے ہیں۔ "راست و دروغ بر گردن راوی" کی رسم تو بہت پرانی ہے۔ لیکن یہ کہ ہر بات کو سچ سمجھ لینا اور اُس کو ایک تہمت بنا کر "راوی" کے سر تھوپ دینا ایک بالکل نئی بات ہے۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کبھی افسانوں میں اپنے جذبات و تاثرات اور اپنے تجربات و عقائد نہیں پیش کرتا۔ لیکن اتنا تو ضرور سمجھ لیجئے کہ میں نے کبھی اپنا کوئی عقیدہ یا اپنا کوئی تجربہ فسانہ میں بجنسہ نہیں بیان کیا ہے اور نہ کوئی فسانہ نگار ایسا کرتا ہے۔ فسانہ کی بنیاد واقعات پر ہوتی ہے نہ کہ کسی نظریہ یا فلسفہ پر۔ اور اسمیں اگر کہیں کوئی نظریہ یا فلسفہ آجاتا ہے تو وہ انھیں واقعات کے رنگ میں رنگ جاتا ہے، جن سے اس افسانہ کی ترتیب ہوئی ہے۔

فطرت، کائنات، حیات انسانی، خدا، جبر و اختیار، خیر و شر، گناہ و ثواب کے بارے میں میرے خیالات کیا ہیں؟ اس مسئلہ کو یہاں چھیڑنے کی گنجائش نہیں ہے تاہم اشارتاً اور اجمالاً کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔ میں جب کبھی زندگی کی ماہیت اور اُس کی ہیئت پر غور کرتا ہوں تو بعض اوقات دل سے چلا اٹھتا ہوں:

"تھا بد و نیک جہاں سے میں عدم میں آزاد   ہائے کس خواب سے ہستی نے جگایا مجھ کو"

اور اگر میں دعوے کے ساتھ یہ نہیں کہتا:۔

"چاہتے ہیں سو آپ کرتے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا"

تو یہ ضرور کہتا ہوں :۔

"کوئی مختار کہو یا کوئی مجبور کہیں
ہم سمجھتے ہیں جہانتک کہ ہیں مقدور ہمیں"

اس دنیا کی زندگی، اسکے رنج و راحت، اسکی کامیابیوں اور ناکامیوں

اُس کی دشواریوں اور آسانیوں غرضکہ اُسکے ہر مدوجزر کے متعلق میرا خیال

ہے کہ وہ کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ بہت سے ایسے اسباب

وعلائق ہیں جو انسان کی انفرادی زندگی پر مؤثر ہوتے ہیں اور اس کو مجبور و پابند

رکھتے ہیں۔ ان میں خدا بھی ہے، عناصر بھی۔ ہیئت اجتماعی اور نظام تمدن

بھی ہیں جذبۂ ازدواج بھی ہے جسکو عرف عام میں محبت کہتے ہیں۔ اور پھر

ان سب کا مجموعی نتیجہ یعنی ایک شخص کا اپنا کردار بھی ہے۔ جس سے وہ شخص اسی قدر

مجبور ہے جس قدر کہ اور اسباب سے۔ میں اگر یہ کہتا ہوں کہ :۔

"کیا پوچھتے ہو کہ زندگانی کیا ہے
ہم کیا کہیں تم سے یہ کہانی کیا ہے
پڑ جائے جو سر پہ جھیل جانا مجنوں
غم کہتے ہیں کس کو شادمانی کیا ہے"

تو اپنے تجربہ اور مطالعہ سے مجبور ہوں۔

ثریا (اس سے بحث کہ وہ مرد ہیں یا عورت) یہ سن کر اچھل پڑیں گی۔

اسلئے کہ میں نے اُن کے مضمون سے جابجا اختلاف کیا ہے۔ مگر وہ تو اپنی

جگہ اب بھی اسی قدر غلطی پر ہیں۔ انھوں نے مجھے صرف فسانوں میں دیکھا
اور بیدھڑک میرے متعلق ایک رائے قائم کرلی۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے
میں کبھی فسانوں میں اپنے عقائد و نظریات لیکر حاضر نہیں ہوتا، اور نہ مجھے
اپنے عقائد و نظریات میں اتنا غلو ہے۔ میرے بہی خواہ مطمئن رہیں کہ میری
قنوطیت (PESSIMISM) ہرگز اس حد تک نہیں بڑھی ہے کہ وہ
میرے لئے دعا کریں کہ "خدا ان پر رحم کرے"۔ رہ گیا یہ سوال کہ میرے فسانوں
میں کہاں تک میری اپنی زندگی کے واقعات ہوتے ہیں؟ میں اسکا کوئی
قطعی جواب دیکر آپ لوگوں کو مطمئن کرنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ آپ کے
ظنیات میں میرے لئے بھی بڑا مزہ ہے۔ خدا کرے انکی اشاعت میں روز
افزوں ترقی ہو اور جلد سے جلد میرے پڑھنے والوں کی کثیر سے کثیر تعداد
اس "پندارم توئی" کے طلسم میں پڑ جائے۔

مجنوں گورکھپوری
ایوان اشاعت گورکھپور

۲۹ دسمبر ۱۹۳۱ء

خواب و خیال

(۱)

بچپن کی معصومیت، جوانی کی شورش اور بڑھاپے کی بے بسی ضرب المثل ہے۔ بڑھاپے کا تو مجھے کوئی تجربہ نہیں (اور نہ ہونے کی امید ہے) مگر ہاں اگر زندگی کے ان تینوں زمانوں کے متعلق عوام کے خیالات سچ ہیں تو مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ میرا بچپن بھی نرالا تھا اور جوانی بھی۔ سننے والے کہدینگے کہ "یہ تو آپ کی نرالی شخصیت کا نتیجہ ہے اور اس کا جو کچھ بھی انجام ہو اُسکے تنہا ذمہ دار آپ ہیں"۔ آپ کا کہنا بجا، مگر ذرا گھڑی بھر کے لئے سوچئے تو کہ میں کیا اور میری شخصیت کیا؟ فوق الانسان ہستیوں کے متعلق مجھے کچھ کہنا نہیں ہے لیکن اس دنیائے آب و گل میں آج تک ظلوم و جہول کی نسل میں کوئی ایسا فرد نہیں ہوا جس نے اپنی فردیت یا شخصیت آپ بنائی ہو۔ بابا آدم تو خاص اس ہستی کے بنائے ہوئے پتلے تھے جس نے ایک "کن" میں نہ جانے کتنے عالم بنا ڈالے اور کتنے بگاڑ ڈالے۔ رہے ہم

لوگ سو نہ اپنے پیدا ہونے میں کوئی دخل نہ اپنی زندگی کو اپنی خواہش کے مطابق بنانے کی قدرت، پیدا کیا نہ جانے کس کارفرما قوت نے۔ شخصیت بنائی۔ ماحول یا زمانہ نے۔ اور یہ ایک ایسی قوت ہے جو قبل اسکے کہ ہم کو اس پر کوئی قابو ہو، ہم کو بنا بگاڑ چکتی ہے۔ پھر بتایئے ہم مجبور نہیں تو مجبور اور کس کو کہتے ہیں اور ہم پر یہ "مختاری" کی تہمت نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم تو جیسا بنائے گئے بن گئے، اب اپنے کردار اور اپنی شادیانہ شاد زندگی کے ذمہ دار ہم خود کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ بحث بیکار طویل ہو گئی۔ کہنا صرف اسقدر تھا کہ مجھے زندگی کی آب و ہوا کچھ راس نہ آئی۔

ہاں تو بچپن کا زمانہ بے فکری اور معصومیت کا زمانہ ہوتا ہے، ان دونوں نعمتوں میں ایک سے بھی لذت آشنا نہ ہو سکا۔ ہوش سنبھالنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک عزیز ترین ہستی کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور ماں باپ کے ہوتے ہوئے یتیم ہو گیا، یہ پہلا جھٹکا تھا جس نے میرے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا اور میرے کانوں میں آواز آئی "دیکھ دھوکے سے بچ۔ بے فکری جیسی کسی چیز کا دنیا میں وجود نہیں۔" مجھے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، میں چونک پڑا۔ بفکری نہیں تو معصومیت کیسی؟ جب انسان زندگی اور موت کی غرض و غایت پر غور کرنے لگا، جب اسکی عقل ہر چیز کی ماہیت کی ادھیڑ بن میں پڑ ہی تو اسکا معصوم رہنا معلوم۔ ہمارے "مورث اعلیٰ" نے

یونہی اپنی معصومیت کھوئی تھی اور ہم بھی اسی طرح کھوتے ہیں۔

میرا شعور وقت سے پہلے نشو و نما پا رہا تھا، میں کون و فساد اور "خیر و شر" جیسے اہم مسائل پر جگر کاوی کرنے لگا تھا اور یقین مانیئے تمام نظام کائنات کو ایک شیطانی کارخانہ سمجھنے لگا تھا۔ میری عمر پندرہ سال کی تھی، اس عمر میں ایسے پیچیدہ خیالات! کچھ بے تک سی بات ضرور ہے لیکن یہ کوئی معجزہ نہ تھا، انگلستان کا مشہور شاعر چیٹرٹن اٹھارہ برس کا ہو کر مر گیا اور اس سے پہلے "جریدۂ عالم" پر اپنا نام ثبت کر گیا۔ میں ناکارہ آفت کا مارا اگر ایسے فاسد اور روح فرسا خیالات کی قابلیت رکھتا تھا تو کون سی حیرت کی بات ہے۔ اسکے علاوہ اسی عمر میں مجھ کو تعلیم کچھ اسقدر زیادتی کے ساتھ دی گئی تھی کہ مجھ میں غور و فکر کی پوری صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ انگریزی میں نے حال میں شروع کی تھی اور آٹھویں درجہ میں پڑھتا تھا لیکن عربی اور فارسی میں کافی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ ایک طرف ایسا غوجی "۔ صغریٰ و کبریٰ" اور فقہ کی کتابیں گھول کر پلا دی گئی تھیں۔ دوسری طرف میں اپنی جولانیٔ طبیعت سے اردو اور فارسی شعراء کے کارنامے چاٹ گیا تھا۔

(۲)

میں پندرھویں سالگرہ ختم کر چکا تھا، نویں جماعت میں پہنچ چکا تھا، کہا جا سکتا ہے کہ ہنوز ایک بے شعور طفل مکتب تھا لیکن "بزرگی بعقل است نہ بسال" میں وقت سے پہلے "بزرگ" ہو تھا اور یہ بزرگی نوعیت میں انوکھی

تھی، سوداویت کا زور تھا، مجھے زندگی میں صرف تاریک پہلو نظر آرہا تھا، جس طرف آنکھیں اُٹھا کر دیکھتا تھا موت کھیل رہی تھی کبھی سنتا کہ فلاں آدمی جو کل تک خاصا تندرست تھا چار گھنٹہ بیمار رہ کر مر گیا اور اپنی حسرتیں ساتھ لیتا گیا، کبھی خبر آتی کہ فلاں چمار جو ابھی دو روز ہوئے میرے کھیت میں کام کر رہا تھا دفعۃً مفلوج ہو گیا ہے اور پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ اسکے بال بچے فاقہ کر رہے ہیں۔ ایک دن ایک بھکاری میرے دروازہ پر آیا تعطیل کا زمانہ تھا۔ میں گھر پر موجود تھا، بھکاری نے اپنا سامان گداگری زمین پر بیفکری سے ڈال کر اور ایک آہ کھینچکر کہا:-

ہار جیت جیون لا کھڑی کھیلس جیت جیون گھاس

سب جگ جیتا دیکھ کے بھئے کبیو اُداس

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خود میری ساری ہستی جل کر راکھ ہوئی جارہی ہے میں اپنے کمرہ سے نکل آیا اور پوچھا "کیوں بابا تم پر کیا ایسی پڑی ہے تم کو کس نے ستایا ہے؟"

معلوم ہوا کہ وہ بھکاری ایک خوشحال کاشتکار تھا، ایک ہی طاعون میں اس کا گھر کا گھر صاف ہو گیا۔ ماں، بھائی، بہن، بیوی بچوں میں سے ایک بھی نہ بچ سکا۔ اس حادثہ کا یہ اثر ہوا کہ بیچارہ اپنے دماغ پر قابو نہ رکھ سکا اور سب کچھ تج کر جوگ لے لیا، زمانہ کی ستم ظریفی دیکھئے

کہ پیٹ سے اب بھی مجبور ہے اور بھیک پر بسر کرتا ہے۔ غرض کہ میں جسکو دیکھتا تھا وہ غیرارادی اور غیر شعوری طور پر موت کے منھ میں جا رہا تھا میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتا تھا ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

لیکن اس سے صرف اسقدر متاثر نہیں ہوتا تھا جسقدر کہ عام لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ زندگی کا یہ سارا کھٹراگ محض اس لئے پھیلایا گیا ہے کہ موت کو اپنی جولانیاں دکھانے کے لئے پورا میدان ملے اور میرے خیال میں دنیا کی لذتوں اور شادکامیوں کا بھی یہی مصرف تھا وہ ہماری تلخیوں اور ناکامیوں کے احساس کو اور زیادہ تیز کر دیں۔

میرے دماغ کی یہ نازک حالت نہ جانے میرا کیا حشر کرتی۔ اگر عین اسی وقت میری زندگی میں ایک نیا باب نہ کھلتا۔

میری پھوپھی میرے گاؤں سے تقریباً چالیس کوس کے فاصلہ پر گونڈہ کے ضلع میں بیاہی ہوئی تھیں، سفر کسی قدر دشوار گذار تھا، اسلئے وہ بہت کم آیا کرتی تھیں۔ ابتک وہ صرف چار یا پانچ دفعہ آئی تھیں اور پندرہ بیس روز رہ کر چلی گئی تھیں، اُن کے ایک لڑکی تھی جسکا نام ریحانہ تھا اس کی خوبصورتی کا چرچا اکثر ہوا کرتا تھا، مگر میرے سمر دو دل میں اس سے

خفیف ترین حرارت بھی نہ پیدا ہوئی تھی۔ اب تک میری پھوپھی جتنی بار ہم لوگوں سے ملنے آئی تھیں ریحانہ کو گھر پر چھوڑ آتی تھیں اور مجھے اُس کو دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا اور نہ دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ میں خود اپنے حال میں کچھ اس بُری طرح مبتلا تھا۔

میرے چھوٹے بھائی کی رونماہ کشائی تھی، جہاں اور لوگوں کو دعوتی رقعے گئے وہاں پھوپھی بھی بُلائی گئیں اور میری شامت کہ والد صاحب نے اصرار کے ساتھ لکھ بھیجا کہ ریحانہ کو ایک بار ضرور ساتھ لانا۔ ریحانہ آئی اور مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ واقعی خوبصورت ہے۔ حالانکہ خوبصورتی کا کوئی خاص معیار میرے ذہن میں نہ تھا لیکن ریحانہ کو دیکھ کر میری المنا کی بڑھ گئی۔ جس دنیا کا سر انجام پامالی ہو اُس میں ایسی حسین وجمیل چیزیں کیوں پیدا ہوتی ہیں"؟ دل نے جواب دیا۔ "پامال ہونے کے لئے اگر حسین وجمیل چیزیں نہ ہوں تو پامال کسے کیا جائے؟ برائی کبھی پامال نہیں ہو سکتی، بُرائی تو نام ہے اچھی چیزوں کی پامالی کا"۔

میں نے ریحانہ کو پھر دیکھا اور میری روح مضمحل ہو گئی۔ اس کے بعد میں ریحانہ کو بہت کم دیکھتا تھا۔

یہ بھی میری شامت کہ پھوپھی اس سے پہلے پندرہ بیس روز رہ کر چلی جایا کرتی تھیں، لیکن اب کی دفعہ والد نے ان کو تین چار مہینہ کے لئے

روک رکھا۔ میں گاؤں پر صرف چھٹیوں میں آیا کرتا تھا، اس لئے ریحانہ کو بہت کم دیکھنے کا موقع ملتا تھا اور میں خوش تھا کہ اس سے قریب نہیں ہوں مگر جب کبھی میرا اُس کا سامنا ہوتا تو میں ایسا محسوس کرتا کہ اسکی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔

اسی درمیان میں گرمی کی تعطیل آگئی اور مجھ کو دو مہینہ کے لئے گاؤں پر رہ جانا پڑا۔ اس دوران میں جو کچھ ہوا وہ میرے لئے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ریحانہ نگاہوں سے میرا پیچھا کر رہی تھی۔ میں اس سے بیخبر نہ تھا مگر بے حس ضرور تھا۔ میرے دل پر اسکی نگاہوں کا کوئی اثر نہ تھا مگر ایک دن اور وہ بھی چند لمحوں میں میری دنیا میں جو تبدیلیاں ہو گئیں وہ کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ دوپہر کا وقت تھا، ہر طرف لوگ اپنی اپنی جگہ آرام کر رہے تھے۔ ہوا رُکی ہوئی تھی، میں اپنے کمرہ میں شرابور ابن یمین کا مطالعہ کر رہا تھا، کمرہ کا ایک دروازہ مکان کے اندرونی حصہ میں کھلتا تھا۔ خلاف معمول دروازہ کو حرکت ہوئی۔ میں مڑا کہ دیکھوں کون ہے؟ اتنے میں ریحانہ میرے پاس تھی، میں اپنے خیال کو اچھی طرح اس کی طرف منتقل بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اُس نے مسکرا کر پوچھا:۔

"کہو کیا پڑھ رہے ہو؟ تم کو تو دن رات کتابوں سے کام رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اور بھی مخبوط ہوئے جا رہے ہو۔ دنیا میں دن رات پڑھنے

اور سوچنے کے علاوہ اور بھی کام ہیں جو اس سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں"۔
ریحانہ اگرچہ جاہل مطلق تھی لیکن نہایت چالاک اور پرکار تھی، وہ مجھ سے ایک سال بڑی تھی، اسکی ملامت بیکار نہیں گئی۔ میں نے کتاب کو بند کر کے رکھ دیا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے پوچھا۔
"وہ کون سے کام ہیں؟ مجھے تو اور کوئی کام ایسا نظر نہیں آتا جو پڑھنے لکھنے سے زیادہ دلچسپ ہو، پڑھنا لکھنا بھی ایسی پُر آشوب دنیا میں ایک بے معنی مشغلہ ہے لیکن چونکہ انسان کو تھوڑی دیر کے لئے غم غلط کرنے کا موقع مل جاتا ہے اس لئے اس کو غنیمت سمجھتا ہوں"۔
ریحانہ پر میرے آخری جملوں کا شاید کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُس نے ایک بار چاروں طرف نظر دوڑائی جب اطمینان ہوگیا کہ ہماری گفتگو کو کوئی دوسرا نہیں سُن سکتا تو اس نے اپنے کو آدھے جسم سے میری طرف جھکا کر کہا۔
"بتادوں کہ وہ کون سا کام ہے"؟
میں کسی قدر گھبرا گیا۔ اُس کے حرکات و سکنات میرے لئے غیر مانوس تھے۔ لیکن میں نے حواس کو درست کر کے کہا۔ "ہاں بتاؤ"۔
ریحانہ نے میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر پیار کے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔
"دیکھو ہر وقت خواہ مخواہ تم اپنی جان گھلاتے رہتے ہو، اگر میرا تمہارا

کچھ مدت کے لئے ساتھ ہو جائے تو میں تمہاری یہ عادت بڑے مزے سے چھڑا دوں"۔

اتنا کہہ کر وہ رُک گئی اور اپنی مخمور آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کے چہرے کی سُرخی بڑھ رہی ہے میں بھی اپنے اندر ایک خفیف سی لرزش پا رہا تھا۔ غالباً میرے خون کا دوران بھی تیز ہو رہا تھا۔ ریحانہ نے تبسم کرتے ہوئے کہا۔

"تم پوچھنا چاہتے ہو کیسے یہ عادت چھوٹ سکتی ہے؟ وہ اس طرح"۔ میں نہ سمجھ سکا کہ کیا ہوا؟ میں ایک نئی لذت پا گیا۔ ریحانہ نے میرے ہونٹ اس طرح چومے کہ ہونٹ دُکھنے لگے اور چند لمحوں میں میری اندھیری دنیا میں ایک روشنی سی پھیل گئی، دل میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی کہ یہ لمحے ابھی جاری رہیں، مگر ریحانہ یہ کہہ کر چلی گئی۔

"دنیا میں محبت بھی کوئی چیز ہے" اس کا بھی تجربہ کرو بڑی راحت پاؤ گے"۔

کم از کم اس وقت وہ ایک فرشتہ معلوم ہو رہی تھی جو نجات کی بشارت لیکر آیا ہو۔ اسکے بعد سارا دن میرا سُرور میں گذرا۔ زندگی میں پہلی دفعہ میں نے یہ سُرور محسوس کیا تھا۔ میں نے ٹھان لیا کہ "ہاں محبت کا سُرور تجربہ کروں گا" اور یقین ہو گیا تھا کہ زندگی میں راحت اگر مل سکتی ہے تو محبت کے ذریعے سے۔

اسی رات کو ریحانہ پھر مجھ سے ملی اور پوچھا:۔

"کیوں میری باتوں پر کچھ غور بھی کیا؟"

جواب میری زبان پر تھا۔" ہاں ریحانہ میں محبت کروں گا۔"

ریحانہ نے اپنی فتح پر نازاں ہو کر پوچھا۔ "سچ؟" اور پھر میرا منھ چوم کر چلی گئی۔ اس طرح کئی دن اور کئی راتیں گزریں، اور آخر کار پھوپھی کے رخصت ہونے کی بھی تاریخ آگئی۔ ریحانہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں اپنی دنیا میں پھر ایک تاریک خلا محسوس کرنے لگا۔ لیکن اب مجھے ایک نئی چیز مل گئی تھی جو خوش آئند معلوم ہو رہی تھی۔ میں اس سے محروم ہو کر جی نہیں سکتا تھا تعطیل ختم ہو گئی۔ میں انٹرینس میں آیا۔ اب میرا معمول یہ تھا کہ اگر دو چار روز کی چھٹی ہوتی تو بجائے گھر جانے کے پھوپھی سے ملنے جاتا، ریحانہ میری گرویدگی سے دل ہی دل میں لطف اٹھا رہی تھی اور ہر طرح سے مجھے زیادہ مبہوت کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور روز بروز میں زیادہ مبہوت بھی ہو رہا تھا، یہاں تک کہ مجھے کسی چیز کا بھی ہوش نہ رہا۔ ریحانہ بھی میری ہر تمنا پوری کر رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے تعلقات اس حد تک پہونچ گئے، جہاں تک نہ پہنچنا چاہئیے تھے۔ عزیز و اقارب پر بھی یہ راز ظاہر ہو گیا اور مصلحت اندیشی نے مجھ کو مجبور کیا کہ میں بہت زیادہ ریحانہ سے نہ ملا کروں۔ اس کا میرے قلب پر کیا اثر پڑ رہا تھا، میں بیان نہیں کر سکتا

ریحانہ کے دل کی کیفیت صحیح طور پر مجھے معلوم نہیں؛ شاید اس پر کوئی اثر نہ تھا، میرا جی کتابوں سے بھی اُچاٹ رہنے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کروں؟ اب تک کتابیں غمخواری کیا کرتی تھیں، اب دل بہلانے کی یہ بھی صورت نہیں رہی۔

(۳)

اپنی مصلحت اندیشی پر بھی میں کبھی کبھی ریحانہ سے مل ہی آیا کرتا تھا ریحانہ میں وہ تڑپ وہ کرب و اضطراب نہ تھا جو میری زندگی کا ما حصل ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اس کو محسوس کرتا تھا مگر پھر اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دے لیتا تھا کہ شاید یہ مرد اور عورت کا فرق ہو۔ میں انٹرنس پاس کر چکا تھا، اُستادوں کی امیدیں جھوٹی ثابت ہو چکی تھیں۔ ان کو پورا یقین تھا کہ مجھے اول درجہ ملے گا اور ملا مجھ کو دوئم درجہ، جو طالب علم دن رات ایسی الجھنوں میں سر کھپاتا رہے جن کو علمی مشغلہ سے کوئی تعلق نہ ہو اُسکا امتحان میں کامیاب ہی ہو جانا معجزات سے ہے۔

کالج کی نئی دلچسپیاں شروع ہو گئیں۔ مجھ کو ایک طرف منطق سے اور دوسری طرف شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ میں شاعری اور منطق یا فلسفہ میں کوئی تقابل نہیں محسوس کرتا تھا۔ میرے خیال میں اگر منطق، فلسفہ اور سائنس کو جذبات سے مملو کر دیا جائے تو یہی چیزیں شاعری ہو جاتی

ہیں۔ بہر حال ان مباحث پر مجھے کالج کی لائبریری میں جو کتاب ملجاتی
اُس کو انہماک سے پڑھتا تھا۔ اس طرح چھ مہینے گذر گئے۔

میرا ششماہی امتحان ختم ہو چکا تھا، میں ہر چیز میں اوّل آیا تھا،
اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میں خوش تھا عین اسی زمانہ میں مجھے خبر ملی کہ ریحانہ
لکھنؤ کے کسی متمول تعلیم یافتہ خاندان میں منسوب ہوگئی ہے اور آٹھ دس
مہینہ میں نکاح ہو جانے والا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ مجھے
کسی نے کہیں ایسی اندھیری فضا میں پھینک دیا ہے جہاں کچھ نہیں ہے
اور اگر ہے تو اس کو میں نہیں پا سکتا۔

تین دن کی چھٹی تھی۔ میں ایک ڈوبتا ہوا دل لیکر پھوپھی کے وہاں
گیا۔ سب سے مجھ کو خوشی کا اظہار کرنا پڑا۔ لیکن میں دراصل ریحانہ سے
دو دو باتیں کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ شام کو کہیں جا کر مجھے اس کا موقع ملا۔
میں نے اُس کو گہری نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ اُس نے میری نگاہوں
سے تجاہل کیا۔ میں نے اس کو محسوس کر کے اپنی آنکھیں ہٹا لیں، ریحانہ نے
پھر میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور کہا:-

"بس میرا تمہارا یہیں تک ساتھ تھا۔ ہم کو اب اس محبت کو زیادہ
طوالت نہیں دینا چاہیئے۔ میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا وہ صرف اسلئے
کیا کہ تمہارے اندر ایک رگ بیکار پڑی سو رہی تھی، میں نے اُس کو بیدار کر دیا

اب میں دوسرے کی ہونے والی ہوں، تم بھی کسی دوسرے کے ہو رہو۔ ہاں مجھے یہ سُن کر بڑا اطمینان ہوا کہ مجھے خوبصورت شوہر مل رہا ہے، ورنہ شاید میری زندگی وبال ہو جاتی"۔

ریحانہ کا پُرسکون لہجہ مجھے اور بھی جلائے ڈال رہا تھا۔ مجھے اپنی عزت نفس کا احساس ہوا اور میں نے دل کی ٹیسوں کو دل ہی دل میں چھپا ڈالا مجھے معلوم ہو گیا کہ ریحانہ کو مجھ سے محبت نہیں تھی اور اگر تھی تو محبت بھی اور چیزوں کی طرح ایک دھوکا ہے جو قائم نہیں رہ سکتا۔ میں نے بھی ایک مصنوعی بے کیفی لہجہ میں کہا:

"اچھا جاؤ۔ میری دعا ہے کہ بہار ہو کے رہو جا کے جس چمن میں رہو"۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دعا تھی یا بددعا، لیکن اسقدر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا وہ دُکھے ہوئے دل کی آواز تھی، ریحانہ نے جانے اسکو محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

میرے پُرانے معتقدات اور نظریات نے پھر مجھ پر غلبہ کرنا شروع اور میں اب اُن پر پہلے سے زیادہ وثوق کے ساتھ ایمان لایا، زندگی واقعی ایک بلا ہے جو بلا وجہ آدم اور اُن کی اولاد پر نازل کی گئی ہے۔ عزازیل کو آدم کے ساتھ ازل کی دشمنی تھی۔ شاید یہ زندگی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے میرا دماغی ہیجان یقیناً مجھے مار ڈالتا یا میں خودکشی کر لیتا اگر اس زمانہ میں

کتاب کا کیڑا نہ ہو گیا ہوتا۔ کتابوں نے پھر مجھے بچا لیا۔

(۴)

ایف۔ اے میں مجھے شوپنہار کے مطالعہ کا شوق ہوا۔ جرمنی کے اس شاعر فلسفی کو میں نے اپنے مزاج کے موافق پایا۔ میں اسکو اپنا ہمدرد سمجھنے لگا۔ اس کا یہ خیال کہ ہستی کا ذمہ دار ایک "اندھا ارادہ" ہے جس کو دنیا "مشیت ایزدی" کہتی ہے۔ میرے دل میں بیٹھ گیا، شوپنہار زندگی کو گناہ سمجھتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ شاعری، مذہب اور محبت زندگی کے دکھ میں بہت کچھ تخفیف کئے ہوئے ہیں، اگر یہ تینوں چیزیں نہ ہوتیں تو یقیناً خودکشی ہی سے انسان کی نجات ہوتی، یہاں مجھے شوپنہار سے اختلاف تھا۔ مذہب یا تصوف کو تو میں انسان کی خود فریبی سمجھنے لگا تھا۔ انسان نے جب دیکھا کہ کسی اور صورت سے چین نہیں ملتا تو اپنی بے چینیوں سے جھوٹی لذتیں حاصل کرنے لگا جب دیکھا کہ دنیا میں سوا "نفوس و اموال" کے نقصان کے اور کچھ نہیں ہے تو "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ" کہہ کر تسکین حاصل کرنا چاہی ذرا پوچھئے کہ اللہ آپ کے ساتھ ہو یا نہ ہو آپ صبر نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے۔

رہی محبت سو اس کے متعلق ممکن ہے کہ میں شوپنہار کا قول تسلیم کر لیتا اگر خود میرا تجربہ مجھ کو یہ نہ بتا چکا ہوتا کہ ؎

بعالم ہر کجا درد و غمے بود
بہم کردند و عشقش نام کردند

محبت کی تلخی کو میں نے اور تلخیوں سے کہیں زیادہ ناقابل برداشت پایا۔ لیکن پھر بھی شوہر کا خیال میرے لئے پُرکیف ضرور تھا میں اپنے اندر ایک غیر واضح تمنا پا رہا تھا اور اس تمنا کو محبت کی تمنا کہہ سکتا تھا۔ باوجود اس کے کہ میں بے انتہا افسردہ اور سرد دل ہو چکا تھا۔

کثرت مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ایف۔ اے میں اول آیا۔ میری عمر تقریباً انیس ۱۹ سال کی تھی۔ اب میرے لئے ایک نئی راہ نکلی، گزشتہ دو سال میں میری صحت بہت کچھ خراب ہو چکی تھی۔ میرا معدہ بُری طرح خراب رہنے لگا تھا۔ والدین ہر طرح کا علاج کر چکے تھے۔ آخرکار والد کی رائے ہوئی کہ مجھے لکھنؤ کے طبیبوں کو دکھایا جائے۔ لکھنؤ میں میرے ایک رشتہ کے چچا کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ ان کی عمر کوئی تیس سال کی تھی ان کا نام ابو طاہر تھا، انھوں نے حال میں ایک اعلیٰ خاندان کی مہذب اور تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کی تھی جو زیادہ سے زیادہ دو سال مجھ سے بڑی رہی ہوگی۔

جب زمانہ کو کوئی نئی چال چلنا ہوتی ہے تو وہ اس کے لئے صورتیں بھی خوب نکال لیتا ہے۔ والد مجھے لکھنؤ لے گئے اور ابو طاہر صاحب کے

مکان پر ٹھہرے (میں ابوطاہر کو صرف اُن کے منہ پر چچا کہا کرتا تھا) مجھے چند گھنٹوں میں معلوم ہو گیا کہ ابوطاہر صاحب ایک خوش باش بے فکر قسم کے آدمی ہیں اور کسی کے دُکھ درد سے واقعی اثر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ حالانکہ اُن کو یہ مغالطہ تھا کہ اُن کا دل بڑا دردمند ہے۔

میرا معالجہ شروع ہو گیا اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجھے فائدہ ہو رہا تھا۔ ابوطاہر صاحب میری پوری خاطر داری کر رہے تھے مگر مجھ کو نہ جانے کیوں اُن سے کوئی اُنس پیدا نہ ہو سکا۔ ثریا (میری چچی) البتہ میرے خیال کا مرکز بن رہی تھی۔ میں ثریا کو ہر لحاظ سے ابوطاہر صاحب کی ضد محسوس کر رہا تھا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ اتحادِ زوجی کچھ بے جوڑ سا ہے۔ ثریا سے میری پہلے کی کبھی ملاقات نہ تھی، مگر اُس نے اس محبت اور جاں نثاری کے ساتھ میری تیمارداری کی کہ میں اُس سے کوئی اجنبیت نہ محسوس کرنے پایا۔

ثریا کو میری طبیعت کا اندازہ پہلے سے تھا۔ میری سوداویت اور قنوطیت (PESSIMISM) کی خبر مجھ سے پہلے اُس تک پہنچ چکی تھی۔ اُس نے چند دنوں کی کوشش میں میرے دل کو پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں بہت جلد چنگا ہو گیا اور اب کبھی کبھی یہ سوچنے لگتا کہ اگر کہیں میری زندگی کسی ایسی عورت کے ساتھ گزرتی تو شاید کچھ دن مزے سے کٹ جاتے۔ ثریا اور ریحانہ کا مقابلہ کرتا تھا تو دونوں کو ایک دوسرے

کوئی نسبت نہ تھی۔ ثریا صورت کے لحاظ سے ریحانہ کی شاید پاسنگ بھی نہ رہی ہو۔ لیکن اُس کی نگاہوں میں دل رُبائی نہیں بلکہ خلوص و محبت کا جادو تھا۔ اُس کے حرکات و سکنات میں ایک وقار تھا جس کو میں "صداقت کا وقار" کہوں گا۔ اس کی آہستہ خرامی اور آہستہ کلامی میں ایک تسکین قوت تھی جو دھڑکتے ہوئے دلوں میں سکون پیدا کر سکتی تھی وہ جب باتیں کرتی تو مجھے معلوم ہوتا کہ نیند آرہی ہے اور میں چاہتا کہ وہ یونہی باتیں کرتی رہے۔ ثریا کی گود میں کوئی دو سال کا لڑکا تھا اس پر بھی وہ چوبیس گھنٹہ میں کم از کم آٹھ گھنٹہ ضرور میرے پاس رہتی اور طرح طرح سے میری دلدہی کرتی کبھی کوئی افسانہ پڑھ کر سُناتی، کبھی زبانی اشعار سُناتی، فارسی اور اُردو شاعری میں اُس کا مذاق بہت شُستہ تھا، کبھی خود میرا لکھا ہوا کوئی مضمون پڑھتی اور ہنس ہنس کر اُس پر ہلکی ہلکی تنقید کرتی۔ مختصر یہ کہ روزِ اوّل سے اُسکو میرے ساتھ جو لگاؤ ہوا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ ثریا کو اگر مجھ سے محبت نہیں تو ہمدردی ضرور ہے اور مجھے اس سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی۔

میں اب بالکل تندرست تھا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ طبیبوں کا اعجاز تھا یا ثریا کا۔ والد نے گھر واپس ہونے کی تیاری شروع کر دی۔ ثریا کو چھوڑنے کے خیال سے میری روح کو تکلیف ہو رہی تھی۔ ثریا بھی مضمحل نظر آرہی تھی۔ ایسے نازک وقت میں ابو طاہر صاحب نے جو نئی رائے دی اس کیلئے

مجھے اپنے دل میں ان کا ممنون ہونا پڑا۔ انھوں نے والد سے کہا:۔
"میری رائے میں بہتر یہ ہوگا کہ اب نسیم بی۔ اے یہیں کالج میں
پڑھیں اور فلسفہ میں آنرز کریں"۔
ثریا نے فوراً کہا "ہاں اور یہاں ان کی پژمردہ دلی بھی دور ہوجائیگی
یہ نہ جانے ہردم کن خیالات میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں میں انکو راہ راست پر
لے آؤں گی"۔
یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا اور ہنس دی، میں بھی ہنس دیا لیکن
مجھے فوراً یاد آیا کہ ریحانہ نے بھی یہی کہا تھا۔ میں اپنے مستقبل سے تھوڑی دیر
کے لئے گھبرانے لگا مگر ثریا کی صورت صداقت و محبت کی تصویر تھی۔ ن
والد مجھے لیکر گھر واپس آئے۔ پندرہ بیس دن میں مجھے اپنا پوراسامان
درست کرکے لکھنؤ چلا جانا تھا، یہ مدت کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ بڑی مشکل سے
خیر وہ دن آیا کہ میں پھر ثریا کے پاس پہنچ گیا، اس جگہ یہ بتا دینا چاہتا ہوں
کہ میں نے صرف چند ماہ تک ثریا کو رسماً چچی کہا اُسکے بعد مجھے حق مل گیا کہ
اُس کو اُس کے دلکش نام سے مخاطب کیا کروں اور پھر میں اُسکو تنہائی
میں ثریا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

(۵)

یوں تو ثریا کو جب میں نے پہلی بار دیکھا میری روح نے اُس سے

کچھ ایسے نقوش قبول کر لئے تھے جو قطعی غیر فانی تھے لیکن دن رات کی صحبت نے میری تمام ہستی کو اسکی ملکیت بنا رکھا تھا وہ جس وقت جو چاہتی مجھ سے منوا لیتی وہ اپنی پوری توجہ صرف اس بات پر صرف کر رہی تھی کہ میری وحشت اور اندرونی شورش دور ہو جائے۔ اس کے لئے وہ ایسی تدبیریں اختیار کرتی رہی جو بدترین دہریہ میں ایک انقلاب پیدا کر سکتی تھیں۔ اس نے کبھی مجھ سے پُرزور لہجہ میں اختلاف نہیں کیا بلکہ جو کچھ سمجھانا ہوتا اُس کو اس پیرایہ میں سمجھاتی کہ چاہے میں سمجھتا یا نہ سمجھتا کم از کم اُس پر ظاہر کر دیتا کہ سمجھ گیا۔

میری گرویدگی بڑھ رہی تھی میں نے ابھی تک اس کا اظہار کُھلے الفاظ میں نہیں کیا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ خیال مجھ پر قابو پانے لگا کہ ثریا کو حقیقت حال سے آگاہ نہ کرنا دغا بازی ہے۔ مجھے اس کو ایک بار اپنے دل کی کیفیت سے آگاہ ضرور کر دینا چاہیئے۔ اگر اُس کو میری محبت ناگوار ہے تو میں اُس کو چھوڑ دینے کی کوشش کروں گا۔ ایک دن کالج سے واپس آیا۔ نومبر کا مہینہ تھا، ثریا برآمدہ میں بیٹھی انگیٹھی پر چاء تیار کر رہی تھی دوسری طرف برآمدہ میں ماما لڑکے کو کھلا رہی تھی۔ میں کتابوں کو اپنے کمرہ میں رکھ کر سیدھا ثریا کے پاس گیا۔ اس نے اپنا مسکراتا ہوا چہرہ اُٹھایا اور مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔ "کیوں کچھ پریشان سے معلوم ہو رہے ہو؟ کچھ طبیعت خراب ہے یا

یونہی حسب معمول وحشت کا دورہ ہے؟"

میں نے اسکا کوئی جواب نہیں دیا اور کہا "ہچی میں کئی دن سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں اور بغیر کہے رہ بھی نہیں سکتا۔ سُن لو اور اللہ، اگر وہ بات معیوب ہو تو مجھ کو معصوم سمجھ کر معاف کر دینا۔ میں پھر اس کا تذکرہ بھی نہ کروں گا۔"

ثریا نے میرا دامن پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور پوچھا۔ "کیوں خیر تو ہے؟ وہ کون سی ایسی بات ہے جس کو تم مجھ سے کہتے ہوئے ڈرتے ہو اور جس کو مجھ سے اس التجا و آرزومندی کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہو؟ تمہاری صورت بیکسی کا اظہار کیوں کر رہی ہے؟ کیا مجھ سے تم کو کوئی صدمہ پہونچا ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شاید بُرا کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا، ثریا نے میرے ہاتھ ہٹا دئے اور میرے بالوں میں ہاتھ پھیر کر بولی :۔

"کیوں بُرا کیوں کرتے ہو؟ کیا محبت کوئی گناہ ہے؟"

میں نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں گناہ ہے یہ زندگی ہی گناہ ہے، اس کی ہر چیز گناہ ہے۔"

ثریا نے میرا سر اوپر اٹھایا اور بولی: "دیکھو تم اپنی پرانی روش پر چل نکلے، میں تمہاری طبیعت نہیں بدل سکتی اور نہ بدلنا چاہتی ہوں مگر ہر بات کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ تم سے کس نے کہا محبت گناہ ہے تم اس کو کیا جانو۔"

میں نے اُس سے ریحانہ کا واقعہ بیان کر دیا۔ ثریا نے مجھ کو ملامت نہیں کی۔ اس نے کہا:

"تو تم کو محبت کا تجربہ ہوتے ہوتے رہ گیا، میں ریحانہ سے واقف نہیں ہوں، مگر اتنا جان گئی کہ وہ دل والی عورت نہیں ہے۔ وہ محبت نہیں کر سکتی، ورنہ وہ دوسرے کی بیوی ہو کر بھی تم سے محبت کر سکتی تھی، محبت ایک لطیف اور پاکیزہ جذبہ ہے جس کو دنیا کی کثافتوں سے کوئی سروکار نہیں خیر یہ جان کر مجھے بڑی راحت ملی کہ تم محبت کر سکتے ہو اور مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میں تو تم کو ایک بیدل جانور سمجھتی تھی۔ میں خود تم سے جیسی محبت کرتی ہوں اُس کو میرا دل جانتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اگر تمہاری ایک اُنگلی دُکھ جائے تو میں اپنا دل دکھانے کے لئے تیار ہو جاتی ہوں۔ نہ جانے تمہاری کون سی ادا بھا گئی۔ شاید تمہارا مرجھایا ہوا چہرہ اور تمہاری کمھلائی ہوئی روح۔ تم چاہے مانو یا نہ مانو لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر جیسا تم کہتے ہو یہ دنیا واقعی دل جلوں کی ایک انجمن ہے تو اس میں

محبت ہی ایسی چیز ہے جو ہماری سوزش کو کم کئے ہوئے ہے۔ اس درد کو تم کیا جانو۔ اس کو صوفیوں سے پوچھو، سادھوؤں سے پوچھو جو تمہاری طرح ہر وقت عالم محسوسات میں کھوئے نہیں رہتے"۔

میں نے ثریا کی باتوں میں بڑا سکون پایا۔ لیکن ایک بات سے اختلاف کئے بغیر نہ رہ سکا، میں نے کہا:۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ عالم محسوسات ایسا پرآشوب اور المناک عالم ہے میں اس سے ایک لمحہ کے لئے تجاہل کرنا بے حمیتی اور کمزوری کی دلیل سمجھتا ہوں"۔

ثریا اس کا جواب نہ دے سکی، ابوطاہر صاحب آتے ہوئے دکھائی دئے۔ ثریا نے کہا:۔

"اب ذرا ٹھہر کر اطمینان سے باتیں ہوں گی"۔

ہم لوگ چاء پی چکے، ابوطاہر صاحب کلب چلے گئے۔ ثریا نے اسکے بعد ایسی پیاری پیاری باتیں کیں کہ بےساختہ جی چاہتا تھا کہ اپنا "دین" چھوڑ کر اس کا مرید ہو جاؤں۔ اس کا یہ کہنا کہ محبت انسان کے دکھ میں بھی ایک خاص لذت پیدا کر دیتی ہے اور دل و جگر کی جراحتیں اس کے لئے سرمایۂ راحت بنجاتی ہیں، نہ جانے کون سا جادو تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے ثریا نے آنسو پونچھ کر اور میری پیشانی چوم کر کہا "یہ کیا"؟

میں نے کہا۔ ”کچھ نہیں اپنی شامت پر روتا ہوں۔ دیکھو مستقبل کیا رنگ لاتا ہے“؟

ثریا نے کہا۔ ”ان توہمات کو دل سے دور کر دو۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرینگے اور سب کچھ بھول جائیں گے۔ تم نے کبھی حافظ کے ان اشعار پر غور کیا ہے؟

بلبلے برگ گل خوش رنگ در منقار داشت
واندراں برگ و نوا صد نالہائے زار داشت
گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق برایں کار داشت

”دیکھو محبت ایسی چیز ہوتی ہے۔ اس کا پہلا سبق تسلیم و رضا ہے درد کے ہوتے ہوئے اسکی ٹیسوں کو نہ محسوس کرنے کی یہی ایک صورت ہے تم انسان ہو کر اس بلبل کی ہمسری بھی نہیں کر سکتے“؟

ثریا تصوّف بک رہی تھی۔ میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسکی صورت دیکھ دیکھ کر طبیعت اُمڈی چلی آ رہی تھی اور میں رو رہا تھا۔ ثریا نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ میں جب خوب رو لیا تو اس نے پوچھا:۔

محبت کا اظہار کرنے کے بعد اور یہ جاننے کے بعد کہ میں بھی تمکو چاہتی

ہوں کیا تمہاری بے چینیوں میں کمی نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا۔" ہاں بہت کمی ہوئی اور میری دعا یہ ہے کہ تم کو اس کا اجرِ جمیل ملے"۔

ثریا میرا جی بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے ایک افسانہ "شعبدہ روزنگار" کے عنوان سے لکھا تھا جو ایک مقتدر اُردو رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ افسانہ پر شوپنہاری فلسفہ کا رنگ غالب تھا، ثریا مجھ سے ایک روز پہلے اس پر بحث کر چکی تھی۔ اس کی رائے میں افسانہ کا پلاٹ اور اسلوب کچھ اس قدر پُر اثر تھا کہ بڑے سے بڑے راسخ الاعتقاد کو اپنے عقیدہ سے منحرف کر سکتا تھا لیکن ثریا اس کو "دل فریب توہمات" سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ آج اس نے پھر اسی افسانہ کا حوالہ دیکر کہا۔

"تم نے اپنی کوشش اسی بات پر صرف کر دی ہے کہ محبت کو دنیا کے اور واقعات کی طرح ایک شعبدہ ثابت کر دکھاؤ اور تم اس میں کامیاب بھی خوب ہوئے ہو۔ تمہارے قلم میں زور ہے، دماغ میں قوت ہے، جو چاہو سوچو، جو چاہو لکھو، نہ جانے کتنے اس افسانہ کو پڑھ کر گمراہ ہو جائیں گے۔ لیکن میں اپنے عقیدہ میں پکّی ہوں، میں نے رات کو اپنے دماغ پر بڑا زور دیا اور ساری رات جاگنے کے بعد تمہارے افسانہ کے جواب میں یہ شعر کہہ پائی

اپنی تاثیر کھو نہیں سکتی　　ہاں وفا خاک ہو نہیں سکتی

میں تمہارا سا استدلال اور زورِ بیان کہاں سے لاؤں، مگر نسیم دنیا کی ساری چیز خاک ہو تو ہو محبت کو خاک سمجھنا بدترین گناہ ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ ثریا کبھی کبھی کھیل میں شعر کہہ لیا کرتی ہے اس نے اکثر مجھے اپنے اشعار سنائے تھے، اشعار میں تغزل ہوا کرتا تھا۔ مگر اس شعر نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ نفسیات میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ جب انسان پر جذباتی کیفیت طاری ہو اس وقت اس میں ایمان و ایقان کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ کم از کم اس وقت تو میں ثریا کا ہم اعتقاد تھا، اس کا شعر میرے لئے نوید زندگی تھا۔

(۶)

ثریا کے ساتھ میری زندگی کے بہترین لمحے گزرے ہیں بلکہ میں یہ کہوں گا کہ میری زندگی صرف انھیں لمحوں پر مشتمل ہے جس زندگی کو میں عذاب سمجھتا تھا اس کو ثریا کی دلنوازیوں نے عین سکون بنا دیا روز بروز میں اس میں محو ہوتا گیا اور وہ مجھ میں۔ میرا اس کا چولی دامن کا ساتھ رہنے لگا۔ تعطیلوں میں تو قریب قریب دن دن بھر ساتھ گزرتا ورنہ صبح سے دس بجے دن تک اور چار بجے شام سے دس بجے رات تک ہم کسی نہ کسی بہانہ سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے، مجھے اُسکے بچے سے بڑا انس ہو گیا تھا جب ثریا کے قریب نہ رہ سکتا تو اُسکے بچہ سے دل بہلایا کرتا۔

ہماری یہ گرویدگی لوگوں سے چھپی نہ رہ سکی، ابو طاہر صاحب دل ہی دل میں سمجھ رہے تھے مگر کچھ کہہ نہیں سکتے تھے گھر کی ماما دائی میں بھی سرگوشیاں ہوا کرتی تھیں۔ میرے ماں باپ کو بھی معلوم ہو گیا، اسکی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ میں نے سال بھر کے عرصہ میں صرف ایک تعطیل گھر پر گزاری تھی اور جب گرمیوں کی لمبی تعطیل ہوئی تو مشکل سے ایک مہینہ گھر پر رہا اور پھر لکھنؤ بھاگ آیا، میں پھر متفکر ہو رہا تھا، میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ دنیا کے رسم و رواج سے بیگانگی اختیار کر کے کب تک اس طرح گزارا جائے گا۔ ثریا یہ کہہ کر مجھے اطمینان دلا رہی تھی "بیکار دل نہ دکھاؤ۔ ہم کوئی گناہ نہیں کر رہے ہیں۔ اپنا ضمیر صاف رہنا چاہیئے۔ دنیا جو سمجھے سمجھنے دو، لوگ جو آوازے کسیں کسنے دو، دنیا اور دنیا والوں کا کام یہی ہے" لیکن میرے اطمینان میں خلل پڑ چکا تھا۔

(۷)

بی۔ اے کا دوسرا سال شروع تھا۔ اگست کا مہینہ تھا، ایک دن شام کے وقت احسن جو میرا ہم جماعت تھا اور فلسفہ میں آنرز لیئے ہوئے تھا مجھ سے ملنے آیا۔ کالج کیا سارے لکھنؤ میں یہی ایک شخص تھا جسکو میں اپنا دوست کہہ سکتا ہوں اور جب سے میں روز کسی نہ کسی وقت ضرور مل لیتا تھا ورنہ میں اپنے کلاس میں یا شہر میں کسی دوسرے کو جانتا بھی نہ تھا۔

اُحسن کو بھی میری طرح ادب و فلسفہ سے بڑا اُنس تھا اور اکثر لحاظ سے وہ مجھ پر فوقیت رکھتا تھا لیکن ہم دونوں کی طبیعت میں بڑا فرق بھی تھا، ثریا کی طرح اُس کے خمیر میں بھی تصوف کی زیادتی تھی، دنیا کے حوادث سے وہ جلد اثر نہیں قبول کرتا تھا۔ وہ دنیا اور دنیا کی تلخیوں کو اس قابل نہ سمجھتا تھا کہ اُن پر کوئی اپنا دل دکھائے، وہ بڑی سی مصیبت کو یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا۔

درست اگر نگری سیمیا و نیرنگ است
نشاط مجلس ناہید و فتنہ قمری

باوجود اس اختلاف مزاج کے ہم ایک دوسرے کے رفیق تھے، شاید کسی کا یہ کہنا غلط نہیں کہ ہر چیز اپنی ضد کی طرف مائل ہوتی ہے۔ جس بات نے اسکی قدر میرے دل میں بڑھا دی تھی وہ یہ تھی کہ اس کو عشق کی دولت نصیب تھی۔ وہ اپنی ایک رشتہ کی بہن کو چاہتا تھا جس کا نام شاہدہ تھا۔ شاہدہ کی شادی ہوگئی تھی اور احسن اب بھی اُس کو اسی محویت اور وارفتگی کے ساتھ چاہتا تھا، شاہدہ بھی احسن کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ احسن کہا کرتا تھا "میرے سکون قلب کے لئے اتنا کافی ہے کہ جس دنیا میں میں ہوں اُسی میں شاہدہ بھی ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے"

زمانہ کی کجرفتاری دیکھیے کہ لکھنؤ میں طاعون پھیلا اور شاہدہ کو اسکی نذر ہونا پڑا۔ احسن کچھ دنوں تک اس حقیقت تک کو سمجھ بھی نہ سکا یہ سخت اور

اچانک دھکا تھا لیکن میں اُس کے دل و دماغ کی قوت دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ دو مہینے کے اندر وہ اپنے درد پر قابو پا گیا اور ایسے اندوہناک حادثہ کے بعد بھی وہ اپنے معتقدات سے نہ پھرا۔ البتہ کچھ از خود رفتگی کے عالم میں رہنے لگا تھا اور اس کی صورت پر ایک قسم کی بیکسی برسنے لگی تھی جس کو دیکھ کر میں بیچین ہو جاتا تھا۔

احسن میرے پاس آج ایک مدت کے بعد آیا تھا، میں مکان سے ملحق پائیں باغ میں بیٹھا ہوا تھا جو مکان کے زنانے اور مردانے دونوں حصوں سے ملحق تھا آج کچھ معمول سے زیادہ دلگیر ہو رہا تھا، میرے والد کا خط آیا تھا جو میرے لئے سولی کا حکم لایا تھا میرے والدین میری شادی کر دینا چاہتے تھے، مجھے اس کا علم پہلے سے تھا نسبت پکی ہو چکی تھی لیکن میرے فرشتوں کو بھی یہ گمان نہ تھا کہ یہ طوق اسقدر جلد مجھے پہننا پڑے گا۔ میں عجیب خلفشار میں مبتلا تھا۔ اب تک ثریا سے اس خط کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن میں خود جس سوچ میں پڑ گیا تھا وہ میری جان گھلانے کے لئے کافی تھا۔

احسن نے میرے بشرہ سے میرے اندرونی ہیجان کا پتہ لگا لیا، اور پوچھا۔ "آج تم کھوئے ہوئے سے معلوم ہو رہے ہو۔ کہو کیا تازہ فکر ہے؟"

احسن اُن دوستوں میں سے نہ تھا جن سے دل کی بات چھپائی جائے وہ میرا ہمراز تھا اور میری اب تک کی زندگی سے بخوبی واقف تھا، میں نے

والد کا خط پڑھ کر سُنایا اور کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نئی آفت سے کیسے بچوں؟ لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ میں ثریا کے دام میں گرفتار ہوں اس لئے شادی سے انکار کرتا ہوں۔ اسمیں شک نہیں کہ مجھے ثریا سے محبت ہے اور ایسی محبت ہے کہ شاید مرتے دم تک ہٹ نہ سکے۔ میں اُس کی محبت کو اپنے حق میں ایک سرمدی راحت کی بشارت سمجھتا ہوں۔ میں زندگی کو عذاب سمجھتا ہوں لیکن کبھی کبھی اب اسمیں وقتی راحت بھی پانے لگتا ہوں اور ثریا مجھے چاہنے لگی خیال ہوتا ہے کہ شاید مرنے کے بعد یہ محبت ابدی سکون کا ذریعہ بن سکے۔ لیکن یقین مانو اگر میں نے ثریا کو کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوتا تب بھی میں شادی کرنے پر تیار نہ ہوتا، میری الجھنیں یوں کیا کم ہیں جو ایک نیا سودا مول لوں"۔

احسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "ہاں میاں سچ کہتے ہو اگر محبت نہ ہوتی تو زندگی کی تلخیاں ناقابل برداشت ہو جاتیں۔ لیکن مجھے تمہاری کم ظرفی اور تنگ حوصلگی پر افسوس ہے۔ تم آخر اس منزل پہ کب پہونچو گے جب کہ خلوص دل کے ساتھ یہ کہہ سکو۔

جاں مطرب ترانۂ ھَل مِن مَّزِید ہے
لب پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

زندگی پر اگر فتح پانا ہے تو اس کی اُلجھنوں سے بھاگو نہیں بلکہ اُن کو لبیک کہو اور اُن کا مقابلہ کرو۔ رہ گئی محبت، سو محبت ایک بار پیدا ہونے کے بعد کبھی مٹتی نہیں، محبت غیر فانی، محبت کرنے والا غیر فانی، تم نے ثریا کو چاہا، یہ تمہارے لئے یقیناً سرمدی راحت ہے۔ تم شادی کرو یا نہ کرو اگر تم واقعی ثریا سے محبت کرتے ہو تو یہ محبت تمہارے اور ثریا کے بعد بھی دونوں کی خاک کے ذرّوں میں جاری و ساری رہے گی، یہ کوئی شاعری نہیں ہے بلکہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جو آپ اپنا ثبوت ہے مجھے دیکھو۔ شاہدہ کی خاک کے ذرے بھی منتشر ہو چکے ہوں گے مگر میں اپنی محبت کے ساتھ جہاں تھا وہی ہوں۔ بہت ممکن ہے۔ دنیوی ضرورتوں سے مجبور ہو کر شادی بھی کر لوں لیکن اس سے مجھ میں یا میری محبت میں کوئی فرق نہ آئے گا"۔

احسن نے محبت کا تصوف مجھے خوب سمجھایا مگر میں ان کافروں میں سے ہوں جن کی تشفی جلدی نہیں ہوا کرتی، احسن مجھے سمجھا بجھا کر چلا گیا میں اسی پائیں باغ میں بیٹھا سوچتا رہا۔ احسن کو گئے ہوئے مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ زنانہ مکان کا دروازہ کھلا اور ثریا برآمد ہوئی، اور سیدھی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا: "ثریا میرا دل دھڑکتا ہے کہ دیکھو ہماری محبت کا انجام

کیا ہوتا ہے؟ میں تمہارا نقش دل سے کبھی نہیں مٹا سکتا، یہ شاید ہم دونوں کے لئے بُرا ہو"۔

ثریا نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا :-

لطف دنیا کا جب اُٹھاؤ گے
دو ہی دن میں تو بھول جاؤ گے

میں اس کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا اور مجھے ثریا کا یہ کہنا بہت بُرا معلوم ہوا۔ ثریا کو جب معلوم ہوا کہ میرے دل کو اس کی بات سے ٹھیس لگ گئی ہے تو وہ بڑے پیار سے مُسکرائی اور مجھے لپٹا کر کہنے لگی :-

"مگر آخر اس وقت ایسی کون سی آفت آپڑی ہے کہ تم خواہ مخواہ آئندہ کے خیال سے کڑھو، اس وقت اس صحبت کو غنیمت سمجھو اور اُسکی لذتوں کو خاک میں نہ ملاؤ، اس سے بڑھ کر تم اور کیا چاہتے ہو۔ میں تمہارے پاس ہوں اور اگر تم سمجھنا چاہتے ہو تو سمجھو کہ میں تمہاری ہوں لیکن خدا کے لئے بیکار اپنا دل نہ جلاؤ۔ تمہاری دلکش صورت اور یہ افسردہ دلی کچھ بے تک سی باتیں ہیں"۔

یہ کہہ کر اُس نے مجھے خوب پیار کیا۔ میں نے بھی جی بھر کر اُس کو پیار کیا لیکن میرے دل کا بار ہلکا نہ ہوا اور میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا :-

زمکر چرخ نظیری عجب ہراسانم
کہ کارہائے مرا بر مراد من دارد

ثریا نے کہا۔ "خدا تم پر رحم کرے، تم کو معلوم نہیں کہ انسان کے خیالات کا اسکی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے، مزن فال بد کا درد حال بد"۔

میں نے کہا۔ "ثریا! اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں، لوگ میری شادی کرنا چاہتے ہیں"۔

یہ کہہ کر میں نے خط نکال کر اس کو دینا چاہا۔ اس نے کہا:۔

مجھے سب معلوم ہے۔ تم سے اور احسن سے جو باتیں ہو رہی تھیں، میں کھڑی سن رہی تھی، میں بھی اسکا جواب وہی دونگی جو احسن نے دیا ہے"۔

میں نے کسی قدر جھنجھلا کر جواب دیا۔ "تم لوگوں کا نہ جانے کیسا فلسفہ ہے مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ دل میں تمہارا خیال لئے رہوں، اور پھر ایک دوسری عورت کے ساتھ پیمان وفا باندھ کر خوش گوار زندگی بسر کروں، میں صاف انکار لکھ بھیجتا ہوں"۔

"ہرگز نہیں، میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی"۔ ثریا نے تحکمانہ لہجہ میں کہا تم دیکھتے نہیں میری بھی تو شادی ہو چکی ہے لیکن کیا میں تم سے محبت نہیں کرتی، شادی تو دنیا کا کاروبار ہے اس سے اور محبت سے کیا سروکار ہے؟

اس کے بعد اس نے موضوع بدل دیا، کہنے لگی۔ "آج جی چاہتا ہے تمھیں کچھ گا کر سناؤں۔ اچھا جاؤ ہارمونیم اٹھا لاؤ"۔

میں ہارمونیم اٹھا لایا اور اس نے سب سے پہلے نظیری کی وہ غزل چھیڑی

جس کا ایک شعر یہ ہے

سازو برگ بوس و آغوش و کنارت دادہ اند
پیش ازیں چوں نے نہی باید دم از دوری زنی

اس شعر کو ثریا نے بڑے کیف انگیز انداز سے گایا اور پھر اپنی محبت طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرائی، مجھ سے نہ رہا گیا میں نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اُس کے ہونٹ چوم لئے ثریا دیر تک میری آغوش میں پڑی رہی مگر آج نہ جانے کیوں اُسکی آنکھیں نم تھیں میں نے وجہ دریافت کی۔ اُس نے کہا:۔

تم ان آنسوؤں کی فکر نہ کرو۔ ممکن ہے یہ مسرّت کے آنسو ہوں"۔

(۸)

دسمبر کی چھٹّیوں میں تاہل کی زنجیر میرے گلے میں ڈال دی گئی۔ میری دنیا میں تازہ مصیبتوں کی بنیاد پڑ گئی اتنی خیریت تھی کہ ابھی صرف نکاح ہوا تھا، رخصتی دو سال ٹال رکھی گئی تھی۔ یہ بھی شاید میرے باپ کی دوراندیشی تھی کہ انھوں نے مجھے آنے والی قید و بند کے خیال سے موانست پیدا کرنے کے لئے مہلت دی' ورنہ اندیشہ تھا کہ اپنی وحشت سے مجبور ہو کر کوئی غیر معمولی حرکت کر بیٹھتا اور داماں و گریباں پھاڑ کر کسی طرف نکل جاتا لیکن مصلحت اندیشیوں نے مجھے محسوس کرنے کا موقع نہ دیا کہ میں کس بلا میں

مبتلا کر دیا گیا ہوں۔

ثریا میرے نکاح میں شریک ہوئی اور بظاہر بڑے ارمان اور حوصلہ کے ساتھ مجھے اور میری دلھن کو بنایا سنوارا۔ لیکن جس وقت میرے سہرا بندھ چکا ہے اور گھر کی دوسری عورتوں کے ساتھ وہ بھی میری بلائیں لینے آئی ہے اسوقت میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ کپاس سا ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا اب بھی رہی تھی مگر اسکی مسکراہٹ میں مسرّت کی کوئی کیفیت نہ تھی، وہ اس روح فرسا حقیقت کو مجھ سے چھپا نہ سکی کہ وہ ایک جانگسل آزمائش سے مقابلہ کر رہی ہے ثریا کی مغموم صورت اُس کے دل کا راز بُری طرح کھول رہی تھی، اور میں اُس کی تاب نہ لا سکا، اگر میں فوراً عقد کے لئے باہر نہ لے آیا گیا ہوتا تو دل پہ ہرگز قابو نہ رکھ سکتا اور اسی جگہ شاید دونوں رسوا ہو جاتے۔

جبتک ثریا میرے وہاں تھی مجھ سے تنہائی میں کبھی نہیں ملی اور مجھے اس کا موقع نہیں دیا گیا کہ میں اس سے کچھ کہتا۔ اتنا میں جان چکا تھا اور یقین کے ساتھ جان چکا تھا کہ ثریا اس خیال کو بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ میں اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت کا ہو کر رہوں، اس نے مجبور کیا تھا کہ میں گھر والوں کا ارمان پورا کروں اور شادی سے انکار نہ کروں لیکن خود اس کے دل پر جو گزر رہی تھی اس کو اس نے مجھ سے بھی چھپا ڈالنے کی کوشش کی۔

ابوطاہر صاحب میرے نکاح کے دوسرے ہی دن لکھنؤ چلے
گئے لیکن ثریا نے پوری چھٹیاں میرے گھر گزاریں اور میرے ہمراہ لکھنؤ آئی
ہم لوگ رات کے وقت لکھنؤ روانہ ہوئے، سکنڈ کلاس کا سفر تھا پورا
ڈبہ خالی تھا۔ گویا قدرت کی طرف سے اس کا انتظام کیا گیا تھا کہ آج دو
چاہنے والے دلوں کو راز و نیاز کا پورا موقع دیا جائے اور پھر اُنکے جذبات کو
اس طرح برانگیختہ کیا جائے کہ وہ اپنی خرابی کے آپ درپے ہو جائیں۔ ثریا
سامنے کی بنچ پر تھی۔ میں اخبار ہاتھ میں لئے سگرٹ پی رہا تھا۔ دو تین
اسٹیشنوں تک دونوں طرف سے سکوت تھا۔ مجھے اسکا ملال تھا
کہ ثریا نے مجھے دھوکہ دیا اور اپنے دل کی اصلی حالت مجھ سے چھپائی۔
آخر کار ثریا نے مجھے چھیڑا اور کہا "تو اب تم دوسرے کے ہوگئے
مجھے یقین نہیں آتا، مجھے امید نہیں تھی کہ اسقدر جلد تم بیوی والے ہو جاؤ گے"۔
میرا پیمانۂ ضبط لبریز ہو چکا تھا اور پھر اس نے ان جملوں کو کچھ ایسے
حسرت بھرے لہجے سے ادا کیا کہ میں اپنی خاموشی کو برقرار نہ رکھ سکا، میں
نے کہا "ثریا تمھیں کیا ہوا ہے؟ تمھاری حالت میری سمجھ میں نہیں آتی
تم کس قسم کی عورت ہو؟ میں جب پہلے کہتا تھا کہ ماں باپ کا حکم میں
کبھی نہ مانوں گا اور شادی ہرگز نہ کروں گا تو اس وقت تو تم مجھ سے لڑنے پر
تُل جاتی تھیں اور مجھے آنکھیں دکھانے لگتی تھیں اور اب جبکہ شادی ہوگئی

جب کہ چھوٹے ہوئے تیر کو واپس لانے کی کوئی معقول صورت نہیں تو تم کو اس کا ملال ہے۔ بیکار نہ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش نہ کرو کہ تم کو کوئی ملال نہیں، میں جانتا ہوں اور میں خوب جانتا ہوں کہ تم کڑھ رہی ہو۔ تمھیں میری شادی کا غم ہے، نکاح کے بعد تمھارا جو حال رہا ہے وہ تمھارا غماز ہے بہر حال تم نے ابھی سے میری مشکلیں بڑھا دیں"۔

"دیکھو نسیم بے انصافی نہ کرو، مجھے کوئی ملال نہیں، میری بہترین دعائیں تمھارے اور تمھاری بیوی کے ساتھ ہیں۔ یہ تو میں نے یونہی ایک بات کہہ دی تھی اتنی جلد تم بیوی والے ہوگئے، یہ کچھ غیر مانوس سی بات معلوم ہوتی ہے۔ سوا اس کے اور کوئی بات نہیں"۔

ثریا کی آواز بھرائی ہوئی تھی، اس نے اپنے آنسو چھپانے کی غرض سے میری طرف سے منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کیا، میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ثریا کا منہ اپنی طرف کر کے کہا:۔

"ثریا! یہ کیا؟ تم رو رہی ہو، آج تمھارا وہ فلسفہ محبت کہاں گیا؟ میں خود بے انتہا تلخ ہو رہا تھا۔ اس لئے میری باتیں بھی تلخ تھیں

ثریا نے اپنی پرنم آنکھیں اوپر اٹھا کر کہا:۔

"تم بڑے ظالم ہو، مجھے اس آزمائش میں ثابت قدم نہ رہنے دو گے میں اپنی پوری تاب و طاقت اس کوشش میں صرف کر رہی ہوں کہ میرے

قدم رہِ راست سے ہٹنے نہ پائیں اور تم"۔

میں نے اپنے طنز کو قائم رکھتے ہوئے کہا۔"میں کیا۔ اب واقعات اس پر تلے ہوئے ہیں کہ تمہارے قدم ڈگمگا جائیں اور تم نے خود اس معاملہ میں ان کی مدد کی ہے"۔

ثریا اب ضبط نہ کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، جب خوب رو چکی تو آنسو پونچھ کر کہنے لگی:۔

"خیر خدا تمہارا بھلا کرے جو تم نے مجھے اتنا رُلایا۔ ایک ہفتہ سے میرے دل میں جو جلن تھی آج جا کر وہ دور ہوئی ہے"۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، میرا دل پہلے سے بھرا تھا میں اس کو روکے ہوئے تھا، ثریا کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھوں کے پیمانے چھلک پڑے۔ پھر ہم دونوں نے مل کر خوب آنسو بہائے اور مدت کا غبار نکالا ثریا نے کہا:۔

"مجھے اپنی طبیعت کا غلط اندازہ تھا۔ میں تمہیں اس گرویدگی کے ساتھ چاہنے لگی ہوں کہ آج اس خیال سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے کہ تم نے دوسرے کے ساتھ رفاقت کا عہد کر لیا ہے لیکن خدا گواہ ہے میں ہرگز تم کو بہکانا نہیں چاہتی۔ کم از کم تم مجھ کو غلط نہ سمجھنا، میری دلی تمنا یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ تمہاری زندگی خوشگوار رہے"۔

میں نے ثریا کو روک دیا اور کہا۔ "بس اسوقت سے اگر پھر تم نے
کبھی میری شادی یا بیوی کا ذکر کیا تو اس کا انجام بُرا ہوگا، میں نہ گھر والوں
کی پرواکروں گا اور نہ تمہاری۔ کہیں ایسی جگہ جاکر منھ چھپاؤں گا کہ کسی کو میری
گرد کا بھی پتہ نہ لگے گا۔"

ثریا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور کہنے لگی۔ "تم دیوانوں کی سی باتیں
کرنے لگے۔ نہیں میرے اچھے نسیم یہ سب کچھ نہ ہوگا، تم ہوگے میں ہونگی
یہی دنیا ہوگی۔ ہم کو ایک دوسرے سے جیتے جی کون جدا کر سکتا ہے۔ خیر
آگے چل کر جو ہوگا سو ہوگا، اس وقت تو رات کا یہ سناّٹا ہے اور دو محبت سے
سرشار روحیں یکجا ہیں۔ اس وقت دنیا اور دنیا کی شورشوں کا ذکر کیا"۔

پھر کھڑکی سے باہر چاند کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگی ؎

تا سحر امشب شراب ناب میباید گرفت
خونبہائے شمع از مہتاب میباید گرفت

اور یہی ہوا۔ ساری رات میں تھا، ثریا تھی اور محبت کی بیخودی تھی۔

(۹)

نکاح کو ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر چکا تھا، میں آنرز میں تھا اور
امتحان کے لئے بڑی دُھن اور سرگرمی کے ساتھ تیاری کر رہا تھا امید تھی
کہ کسی خاص امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوں گا، ثریا کی شیفتگی میرے ساتھ

بڑھ رہی تھی اور میں بھی روز بروز اس میں محو ہوتا جا رہا تھا، نہ زمانہ کی نیرنگیوں کا اندیشہ تھا نہ دنیا و مافیہا کی خبر، ہاں ثریا کبھی کبھی بلا کسی ظاہری سبب کے آزردہ ہو جاتی تھی اور مجھے بھی آزردہ کر دیتی تھی۔

امتحان کو مشکل سے دو ماہ رہ گئے تھے کہ پردۂ تقدیر سے ہمارے سکون و اطمینان کی دنیا میں پھر خلل پیدا کیا گیا اور ایسا خلل جسکا اثر دور تک پہونچا اور دو معصوم ہستیوں کو غارت کر کے رہا۔ خود میری زندگی پر اس کا کیا اثر پڑا۔ میں اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا، دنیا سمجھ رہی ہے کہ میں چین کی زندگی بسر کر رہا ہوں اور بظاہر ایسا معلوم بھی ہوتا تھا۔ پھر نہ اسکی ضرورت اور نہ مجھے اس کا حق کہ میں دنیا کا یہ خیال غلط ثابت کرنے کی کوشش کروں۔

تداخل کا موسم تھا، شہر میں فصلی بخار پھیل رہا تھا نہ جانے کتنے اس میں بیمار پڑے اور چنگے ہو گئے اسی سلسلہ میں ثریا کا اکلوتا لڑکا جمیل بھی بیمار پڑا جس کی عمر اب تقریباً پانچ سال کی تھی۔ جمیل کو تپ چڑھی، ڈاکٹر آیا، فصلی بخار تجویز کر کے نسخہ لکھا گیا، دوا کا استعمال ہوا، ایک ہفتہ ہو گیا اور درجۂ حرارت اپنی جگہ قائم رہا، اب اسی تپ کو تپ محرقہ بتایا گیا دوسرا ہفتہ گزرا اور تیسرا ہفتہ گزرا، ایک مہینہ گزرا، دوسرا مہینہ گزرا اور جمیل کا بخار نہ اُترنا تھا نہ اُترا۔ لکھنؤ کے مشہور ترین اطباء اور ڈاکٹروں سے مشورہ

لیا گیا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، سب نے یہی کہا کہ بخار آپ سے آپ اُتر جائے گا۔ لیکن بخار نہ خود اُترا اور نہ کسی کے زور لگائے اُترا۔

ثریا کی صحبت کا اتنا اثر ہوا تھا کہ میں اپنی قنوطیت میں کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا اور اس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر کو خدا سمجھنے لگا تھا جس کے آتے ہی موت "ابلہ" ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹروں کے علاج سے جمیل اچھا ہو جائے گا اور اس نے ثریا کو بھی اس کا یقین دلا دیا تھا، ثریا میری ہر بات پر آمنّا و صدّقنا کہتی تھی، اس لئے اُسے بھی امید بندھی تھی کہ اس کا جمیل اچھا ہو جائے گا، میں بڑی دُھن اور لاگ کے ساتھ جمیل کی تیمارداری کر رہا تھا، نہ دن کو دن سمجھتا تھا اور نہ رات کو رات چوبیس گھنٹے جمیل کی خدمت کیلئے کمر باندھے کھڑا رہتا تھا، لوگوں کا کہنا ہے کہ اس سے زیادہ ماں بھی اپنے بچے کے پیچھے ستی نہیں ہو سکتی تھی سال بھر ایک دھن کے ساتھ جمیل کی تیمارداری کرتا رہا۔ آخر کار وہ وقت بھی آ گیا جب انھیں اندھے ڈاکٹروں نے جمیل کو پرانا سِل بتایا اور مجھے "چوں قضا آید طبیب ابلہ شود" کی سنگین حقیقت کو ماننا پڑا۔

جمیل چلتا ہوا، اور ماں کی گود کو اُجاڑ گیا اور میرا یہ اعتقاد پہلے سے کہیں زیادہ راسخ ہو گیا ؎

از بیابانِ عدم تا سرِ میدانِ وجود　　بہ تلاشِ کفنے آمدہ عُریانے چند

ثریا کا قول ہے کہ اس کو اب تک دو ہستیوں سے محبت ہوئی ایک تو اس کا جمیل اور دوسرا میں۔ جمیل یوں داغ دے گیا، میرا کوئی اعتبار نہیں، اب ثریا کی المناکیوں کی کوئی انتہا نہ تھی، کچھ دنوں کے لئے اس کا دماغ ٹل سا گیا تھا، دن رات سوا آنسو بہانے کے اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے ثریا کی طبیعت کو سنبھالا۔ میں اب اپنا زیادہ تر وقت اسی کے دل بہلانے میں صرف کرنے لگا۔ نہ کہیں سیر و تفریح کو جاتا تھا، اور نہ کسی دوست سے ملتا تھا، کالج سے بھی چھٹی لیکر بھاگ آیا کرتا تھا اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو مجھے آنرز میں کوئی امتیاز حاصل ہوا اور نہ ایم اے میں

(۱۰)

جمیل کے مرنے کے بعد کوئی سال بھر میں اور ثریا کے ساتھ رہا۔ میں نے بڑا زور لگایا کہ لکھنؤ ہی میں پیٹ پالنے کی کوئی صورت نکل آئے مگر مجھے تو لکھنؤ سے نکلنا تھا اور ثریا سے بچھڑنا تھا۔ لکھنؤ میں روزی کا کوئی ذریعہ نہیں نکلا، مجبوراً مجھے حیدرآباد ایک علمی خدمت پر مامور ہو کر جانا پڑا جانے سے پہلے بیوی رخصت ہو کر گھر آئی اور میرے ساتھ حیدرآباد چلی۔ میں فطرتاً بیحد حساس ہوں۔ ہر بات کا احساس میرے اندر ایک غیر معمولی شدت کے ساتھ ودیعت کیا گیا ہے چنانچہ جس تاریخ سے بیوی میرے پاس آئی، میں نے اپنے دل کو سمجھانا شروع کیا کہ میں

بیوی کے لئے ہوں اور بیوی میرے لئے ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ خام خیالی ہے۔ میں ثریا کو کبھی بھولا نہیں مگر بھولنے کی کوشش ضرور کرتا رہا۔ میں اس کشمکش کو اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ تمنا کروں کسی کی اور مجھے ملے کوئی اور جس کی واقعی تمنا تھی اسکا ملنا محالات سے تھا اس لئے جو مجھے مل گئی اسی کو میں نے اپنا مرکز تمنا بنانا چاہا۔ کہہ نہیں سکتا کہاں تک کامیاب ہوا۔

بہر حال میں بیوی کو لیکر حیدرآباد روانہ ہوا اور لکھنؤ ہوتا ہوا چلا تاکہ ثریا سے راستہ میں ملتا چلوں، لکھنؤ میں دو دن ٹھہرا۔ ثریا نے میری بیوی کی خاطر داری میں بڑے حوصلہ سے کام لیا، پہلے دن، دن بھر مجھے اس سے تنہائی میں ملنے کا موقع نہ ملا، دوسرے دن شام کو جب کہ میری بیوی سامان سفر درست کر رہی تھی، ثریا میرے کمرے میں آئی جو مردانہ میں تھا اسنے آتے ہی کے ساتھ مجھ سے ایک تلخ لہجہ میں سوال کیا۔

کیوں نسیم! گزشتہ صحبتوں کی یاد اپنے ساتھ لئے جا رہے ہو یا گرد کی طرح جھاڑ کر یہیں چھوڑ چلے، جو گھڑیاں یہاں ساتھ گزری ہیں اب ان کو پُر لطف صحبتوں سے زیادہ تو کچھ سمجھنا نہیں ہے"۔

ثریا کے طنز پر میں تلملا اُٹھا، میں نے بھی اسی تلخی کے ساتھ کہا، اب اس یاد کو ساتھ لیجاؤں یا یہیں چھوڑ جاؤں، دونوں میں دراصل کوئی فرق نہیں۔ مگر

خدا کے لئے اتنا بتا دو کہ یہ کس گناہ کی سزا مجھے دی گئی ہے"؟
میں نے آنکھیں اوپر اُٹھائیں تو دیکھا کہ ثریا کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں
میں بیچین ہو گیا اور اس کو لپٹا کر کہا:۔
"ثریا شاید تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تم کو بھول گیا ہوں اور تم سے بیوفائی کر رہا ہوں، کیا اس کے کہنے کی ضرورت ہے کہ میں تم کو اب بھی چاہتا ہوں اور اسی طرح چاہتا ہوں۔ ہاں صورت حال ضرور بدلی ہوئی ہے"۔
ثریا نے بات کاٹ کر کہا ع

"نہ کرو اب نباہ کی باتیں
تم کو اے مہربان دیکھ لیا"

یہ میرا شعر تھا جس کو اس نے شاید اسی دن کے لئے یاد رکھ چھوڑا تھا اس کی صورت پر یاس و حسرت برس رہی تھی۔ میں نے چھیڑ نامناسب نہیں سمجھا اس لئے پیار کے لہجہ میں کہا:۔
"آخر ثریا میں کیا کرتا اور تمہاری کیا آرزو تھی"؟
ثریا نے بے تامل جواب دیا۔"یہ تو میرے بتانے کی بات نہ تھی تم خود سوچتے"۔
"لیکن جب میں شادی سے انکار کر رہا تھا تو سب کی ہاں میں ہاں ملا کر تم نے بھی تو مجھے مجبور کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اب تمہیں بتاؤ میں

کیا کروں؟"

ثریا اب موتی سے آنسو برسانے لگی، دل کی بھڑاس نکال چکنے کے بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔" اور تم شادی بھی نہ کرتے تو کیا ہوتا میں تو جہاں تھی وہیں رہتی۔ آہ!

"تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا"

تھوڑی دیر کے بعد پھر کہنے لگی :۔ "تم کو تمہاری سود اویت اور پیدائشی سرد مہری نے بچا لیا اور مجھے میرے پُر ارمان دل نے کہیں کا نہ رکھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اب تمہارا روگ مجھے لگ چلا ہے اور خسرو کا یہ شعر مجھ پر صادق آرہا ہے ؎

"بے دلے گش عیب میکردم کجاست
تا بہ کام خویشتن بیند مرا"

یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی، میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے، اُس نے مجھ کو آبدیدہ دیکھ کر اپنے کو سنبھالا اور آنسو پونچھ کر کہا :۔

"اُف! میں تمہیں بہکا رہی ہوں یا اللہ مجھے اس آزمائش سے بچا۔ میں بڑی بڑی آزمائشوں سے بچ رہی ہوں، یہ آخری آزمائش ہے، اور سخت ترین، میرے خدا میری مدد کر"۔

یہ کہا اور مجھے لپٹا کر میری پیشانی کا بوسہ لیا، پھر جلدی سے قدم بڑھا کر میری بیوی کے پاس جا پہونچی، اس کے بعد ثریا پھر مجھ سے اکیلی نہیں ملی۔

(۱۱)

حیدرآباد میں میری زندگی ہموار رہی، دھیرے دھیرے میری بیوی نے مجھ پر اپنا سکہ جما لیا، وہ بڑی طبیعت شناس عورت ہے میری سرکش طبیعت اور میرے وارستہ مزاج سے وہ پہلے سے خبردار تھی اور جانتی تھی کہ ایسوں کو کیسے رام کیا جاتا ہے۔ اُس نے میری شوریدہ سری میں کبھی کوئی مداخلت نہیں کی، اُس نے کبھی ان باتوں پر دھیان بھی نہیں کیا جن کا بیویاں عموماً محاسبہ کیا کرتی ہیں، اتنا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہنا اور میرے آرام و آسائش کا خیال رکھنا ضروری سمجھتی تھی ورنہ ہر لحاظ سے مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا حال کبھی تباہ نہ ہونے پایا۔

ثریا سے مجھ سے خط و کتابت عرصہ تک جاری رہی۔ میں اس کو جو کچھ لکھتا تھا قلم روک کر لکھتا تھا اس لئے کہ اغیار سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ دیکھ نہ لیں۔ لیکن ثریا جی کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی تھی اور اپنی تحریر میں دل و جگر کے ٹکڑے نکال کر رکھ دیتی تھی مگر مجھے یہ کہہ دینے میں کوئی عار نہیں کہ میں جہاں دنیا کے اور بہت سے معاملات میں بیدل و بے حوصلہ ہو رہا تھا وہاں ثریا کی طرف سے کچھ کم بے حس نہ تھا، دنیا کے ہنگامے یوں کیا کم

دم گھٹانے والے ہیں جو محبت کی شورشوں کا ان میں اور اضافہ کیا جائے کم از کم میرے کلیجے میں اتنا خون نہ تھا کہ میں ایک نہ ملنے والی چیز کی تمنا کو زیادہ عرصہ تک اپنے دل میں پرورش کرتا، میں بہت جلد تنگ دل ہو کر ثریا کی طرف سے بیخبر ہو گیا۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ میں واقعی ثریا کی محبت دل سے نکال چکا تھا لیکن اب یہ محبت صرف ایک یاد ہو کر رہ گئی تھی جو نام ہے ایک مجہولی کیفیت کا۔ البتہ ثریا کے محبت نامے اکثر میری رگوں میں ہیجان پیدا کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی تو میں دیوانہ ہو جاتا تھا۔ خاص کر اسکے ایک خط نے تو مجھے بری طرح خفقانی بنا ڈالا تھا، یوں تو سارا خط جذبات کا ایک طوفان لئے ہوئے تھا لیکن یہ شعر نہ جانے کس عالم میں لکھا گیا تھا۔

"یاریوں دور جا بسے اللہ
کیا زمانے کا انقلاب ہوا!"

اسی خط سے مجھے معلوم ہوا کہ ثریا کچھ بیمار رہنے لگی ہے۔ اس وقت مجھے حیدرآباد آئے ہوئے پورا ایک سال ہو چکا تھا میں نے سوچا کہ ایک مہینہ چھٹی لیکر ثریا کو دیکھ آؤنگا مگر زندگی کے جھگڑے ہی تو ہیں، مہینوں گزر گئے اور میں سوچتا ہی رہا۔ کبھی ملازمت کی مصلحتیں رکاوٹیں پیدا کرتی رہیں کبھی بیوی کی چھوٹی بچی علالت، کبھی صاحبزادے کی بیماری،

اور کبھی خود اپنی کاہلی اور سستی۔

ثریا کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی، وہ مجھے یہ تو لکھتی تھی کہ ایک بار آکر مجھ سے مل جاؤ۔" مگر اپنی حالت کبھی مفصل نہیں بتاتی تھی۔ آخر کار اس کا ایک خط مجھے ملا جس نے میرے حواس کو آناً فاناً منتشر کر کے رکھ دیا۔ خط یہ تھا:۔

"پیارے نسیم۔ میں بیمار ہوں اور سخت بیمار ہوں بستر سے ہل نہیں سکتی بہت ممکن ہے یہی بستر میرا بسترِ مرگ ثابت ہو، ڈاکٹروں نے سل بتایا ہے یہ وہی مرض ہے جو جمیل کو ہوا تھا، میں خوش ہوں کہ اس سرائے فانی کی صعوبتوں سے بہت جلد نجات حاصل کر کے جمیل سے جا ملوں گی، لیکن آہ تمہیں دیکھنے کی حسرت باقی رہی میں نے بہت چاہا کہ جس طرح تم مجھ سے بے نیاز ہو گئے میں بھی تم سے بے نیاز ہو جاؤں۔ مگر ہر شخص کی طبیعت یکساں نہیں ہوتی، میری زندگی کی آخری تمنا یہ ہے کہ تم کو مرنے سے پہلے ایک بار جی بھر کے پھر دیکھ لوں، شاید تم کو یہ بھی گوارا نہیں ؂

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

مجھے معلوم ہے کہ تم آؤ گے اور روتے اور سر پیٹتے آؤ گے مگر اس وقت

"مگر اللہ رے زمانہ کی زبردستی اور اللہ رے انسان کی بے بسی، اب تمہارا اتنا مقدور بھی نہیں رہا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھ پر کوئی اپنی جان قربان کر سکتا تھا تو وہ تم تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب تم اس قابل نہیں رہے ورنہ مرنے کے بعد یہ اندیشہ لئے ہوئے قبر میں بھی بے چین رہتی۔ کیوں نسیم تم نے اس دنیا کا آغاز و انجام دیکھ لیا، مگر میں نادم نہیں ہوں، میں نے محبت کی اور صرف اس برتے پر مجھے اپنی عاقبت خوش آئند نظر آ رہی ہے"

میں چپ چاپ بُت بنا ہوا ثریا کا منھ تکتا رہا، مجھ سے کچھ کہتے نہ بن پڑا۔

ثریا کی حالت روز بروز گرتی گئی۔ میں نے اپنی رخصت بڑھا لی اور بیوی کو بھی لکھنؤ بلا لیا۔ ثریا نے مجھ سے کچھ زیادہ خدمت بھی نہ لی، مجھے آئے کوئی ڈیڑھ ماہ ہوئے تھے کہ اُس نے اپنی لحد کا راستہ لیا۔ دم نکلتے وقت اس نے خدا کا نام لینے سے پہلے جس کا نام لیا وہ میں بدبخت تھا۔

اور اس کے بعد؟ اس داستان کے پڑھنے والے یہ جاننے کیلئے بیتاب ہونگے کہ میرا کیا حال رہا، سو اس میں اب کچھ ایسی دلچسپی نہ رہ گئی تھی کہ اسکو بیان کیا جائے اور نہ میرا منھ کہ میں بیان کروں، ثریا کی سرگزشت کے بعد اب میرے پاس کیا رہا جس کو میں بطور ضمیمہ کے شامل کر دوں، وہی میں اور وہی میری بیوی، وہی حیدرآباد کی زندگی، ہاں اب دو بچے بھی ہیں اور عمر کٹ رہی ہے

محبت کو میں ہمیشہ دنیا کے اور بہت سے واقعات کی طرح ایک آنی وفانی آفت سمجھتا رہا۔ اور اب میرا یہ عقیدہ اور بھی پختہ ہو گیا ہے ثریا کے ساتھ محبت کر کے رہا سہا وہم بھی خاک میں مل گیا۔

آہ سارا یہ ہے جہان غلط
دوستی کا ہے یاں گمان غلط

کم از کم اس دنیا میں محبت کی اصلیت لے دے کر بس اتنی ہے۔

(۱۲)

میں اس روداد محبت کو نہ جانے کیوں حوالہ قلم کرنے بیٹھ گیا نصف لکھ چکا تھا کہ میری بیوی چھوٹے بچے کو گود میں لئے آگئی اور ایک ایک صفحہ لیکر پڑھنا شروع کیا، پڑھتے پڑھتے کہنے لگی :۔

"کیوں صاحب آخر اب کیا رکھا ہے؟ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب آپ یہ لکھ کر ایک بھولی ہوئی یاد کو کیوں تازہ کرتے ہیں اور جو زخم بھر چکے ہیں۔ اُن کو زبردستی کیوں ہرا کرتے ہیں۔ میں آپ کو ہرگز یہ افسانہ لکھ کر اپنا دل خون نہیں کرنے دوں گی"۔

میری بیوی پکّی دنیادار ہے، اس نے یہ کہہ کر قلم میرے ہاتھ سے لے لینا چاہا۔ میں نے کہا۔

"بیگم آخر تمہارا کیا بگڑا اور کیا بگڑ جائے گا۔ تمہاری راحتوں میں میں نے

کب خلل پڑنے دیا۔ سب کچھ ہو گیا مگر مجھ پر تم مسلط رہیں، اس کا بھی تو موقع نہیں ملا کہ ثریا کے غم میں کچھ دنوں سوگوار رہتا۔ اب کیا میں اس المناک واقعہ کو ایک دلچسپ کہانی بنانے سے بھی رہا۔ تم ڈرو نہیں میرا دل خون نہیں ہوگا۔ اس کو خون ہونا ہوتا تو اب تک کب کا خون ہو کر بہہ گیا ہوتا۔"

بیوی نے قلم میرے ہاتھ میں رہنے دیا اور میں نے افسانہ ختم کر دیا جو اب آپ لوگوں کے سامنے ہے، اس سے جو نتیجہ چاہیئے نکالئے اور جو سبق چاہیئے سیکھیئے۔ مجھ پر تو اس کا اس کے سوا اور کوئی اثر نہیں ہوا کہ یہ چار مصرعے یاد آ گئے :-

جو دل سے نکل گئی وہ چاہت کیا تھی! | بن کر جو بگڑ گئی وہ صورت کیا تھی!
اللہ رے یہ دن مجھے بھی کہنا ہی پڑا! | اک خواب و خیال تھا محبت کیا تھی!

سنہ ۱۹۳۰ء

مدفن تمنّا

(۱)

سلیمان میرا علیگڑھ کا رفیق تھا۔ ہم دونوں نے وہیں سے ساتھ ساتھ ایم۔ اے۔ ایل، ایل، بی کیا تھا۔ آج تک میری سمجھ میں نہ آیا کہ سلیمان نے ایل، ایل، بی کیوں کیا۔ وہ گھر کا رئیس تھا اور اس کو ملازمت یا پیشہ کی دراصل کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ خواب و خیال کی دنیا کا انسان تھا فلسفہ اور شاعری اس کے ریشہ ریشہ میں جاری و ساری تھے۔ اس کے لئے اگر کوئی ذریعہ معاش ہو سکتا تھا تو کسی کالج کی پروفیسری یا پھر صحافت۔ اسی خیال سے اس نے ایم۔ اے کیا بھی تھا۔ لیکن یہ تعزیرات ہند میں امتحان دینا کیا معنی رکھتا تھا؟ سلیمان نے اس سوال کا جواب ہمیشہ یہی دیا کہ "میاں لگے ہاتھوں یہ بھی سہی، حاصل کی ہوئی چیز کبھی رائگاں نہیں جاتی۔"

کالج سے فراغت پا کر میں سلیمان سے چھوٹ گیا اور سالہا سال چھوٹا رہا۔ میں فیض آباد میں اپنے پیٹ کے دھندے میں لگ گیا۔ میری وکالت بالکل اسی طرح چلتی تھی جس طرح میں خود چلتا تھا یعنی قدم رکھتا

کہیں، پڑتا کہیں تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ نہ وکالت میرے لئے بنی ہے
نہ میں وکالت کیلئے، لیکن یہ یقین بہت دیر میں ہوا اور اب کئے کچھ نہ ہوتا تھا
ایم، اے میں کوئی امتیاز حاصل نہیں تھا جو کہیں پروفیسری کر لیتا۔ مجبوراً ایل
ایل، بی کی پیچ کر رہا تھا۔

سلیمان نے نہ کہیں ملازمت کی اور نہ وکالت کی، فارغ التحصیل
ہونے کے چھ ہی مہینہ بعد اسکے باپ کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنی زمینداری
کے کاروبار میں لگ گیا تھا جس کو وہ اپنے لئے سب سے زیادہ موزوں کام
سمجھتا تھا، کسانوں میں رہ کر زندگی بسر کرنا اُسکے خیال میں بہترین راحت
تھی اور انسان کی بصیرت میں تعمق پیدا کرنے کی بہترین صورت تھی سلیمان
روسو اور تھورو کے خیالات اور اُن کی طرز معاشرت سے بیحد متاثر تھا۔
مجھے سلیمان کی صحبت بے طرح یاد آرہی تھی مگر کسی نے سچ کہا ہے
"پراگندہ روزی پراگندہ دل" زندگی کے جھگڑوں میں کچھ اس طرح مبتلا تھا کہ
دوستی اور محبت کا خیال صرف نام کے لئے دل کے کسی کونے میں باقی
تھا جو اُبھرنے کو تو اکثر اُبھرتا تھا لیکن پھر دب کر رہ جاتا تھا۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ زندگی نام ہے صرف فکر دنیا میں سر کھپانے کا" سلیمان نے
بھی میری خبر نہیں لی۔ نہ کبھی مجھ سے ملا اور نہ کوئی خط لکھا۔ وہ فطرتاً کچھ
کاہل بھی تھا اس لئے مجھے اس سے کچھ زیادہ شکایت نہ تھی۔

ایک اتوار کو شام کے وقت میں زنانخانہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ باہر سے ملازم نے پکار کر کہا:۔

"کوئی مہمان آئے ہوئے ہیں اور میاں کو بلا رہے ہیں"۔

میں ذرا مہمانوں سے گھبراتا ہوں اور مجھے گھبرانا بھی چاہیئے، اسلئے کہ جب چوبیس گھنٹہ یہ فکر لگی رہے کہ کس طرح ہاتھ میں آئے اور منہ میں جائے تو ظاہر ہے کہ مہمان ایک تازہ فکر پہنچاتا ہے۔ خیر میں منہ بنا کر اور تیوریاں چڑھا کر اُٹھا اور باہر آیا میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب میں نے دیکھا کہ سلیمان جلد جلد تانگہ سے اپنا سامان اُتروا رہا ہے مجھے دیکھ کر کہنے لگے "السلام علیکم"

میں نے کہا۔ "یہ حقیقت ہے کوئی یا عالم تصویر ہے"۔

یہ اسی کے ایک شعر کا مصرعہ تھا جو مجھے برجستہ یاد آگیا تھا کہنے لگا۔

"شاید دونوں، مگر اسوقت فوراً چائے کا انتظام کرو۔ باتیں پھر اطمینان سے ہوں گی"۔

چائے پینے کے بعد سلیمان نے کہا۔ "میں لکھنؤ آیا ہوا تھا، اور آج آٹھ بجے دن کی گاڑی سے واپس جا رہا تھا، آغا میر کے اسٹیشن پر ٹہل رہا تھا کہ ایک طرف سے میرے کانوں میں آواز آئی:۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو دو شخص بڑے تپاک اور جوش کیساتھ بغلگیر ہو رہے تھے، مجھے اسوقت تم یاد آئے اور اس طرح کہ بے اختیار جی چاہا کہ تم سے ملوں۔ چنانچہ فوراً تانگہ پر بیٹھا اور چار باغ پہنچا اور پھر وہاں سے یہاں پہونچا"۔

میں نے کہا "خدا اُن کا بھلا کرے جن کی بدولت آج تمہاری صورت دیکھنا نصیب ہوئی جسکو دیکھنے کیلئے آنکھیں ترس گئیں"......

سلیمان نے بات کاٹ کر کہا ؎

"شب وصال بیان غمِ جدائی کیا
فضول ہے گلۂ زخم التیام کے بعد"

یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور مجھے لپٹا کر.......... کہنے لگا:۔

"میں کل شام کو چلا جاؤں گا، دیکھو مجھے روکو نہیں، ورنہ میرے کاموں کا حرج ہو جائے گا، میں آج کل کسانوں کی تہذیب و ترقی کی تحریک میں منہمک ہوں جس کا لائحہ عمل قطعاً اشتراکی ہے، ایک طرف حکام دوسری طرف میرے حریف زمیندار میرے دشمن ہو رہے ہیں۔ لیکن نہ یہ میرا ایک بال بیکا کر سکتے ہیں اور نہ وہ، خدا کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے اور میں اس کو خدا کی راہ میں لٹانے کے بعد بھی اپنی زندگی کے دن فراغت میں بسر کر سکتا ہوں، میں نے اپنے عزیزوں کی جائداد سے اپنی انج کی

جائداد بالکل الگ کر لی ہے، تاکہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو۔ ہاں تو
میں کل جاتا ہوں اور تم سے یہ درخواست کئے جاتا ہوں کہ تم ایک ماہ
کے بعد بڑے دن کی تعطیل میں آکر میرے وہاں رہو اور سیر و شکار میں میرے
ساتھ لطف اُٹھاؤ۔ یہ شکار کی لت مجھ سے کسی طرح نہیں چھوٹتی"۔

اسکے بعد سلیمان نے اور بہت سی اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنے
اشعار سنانا شروع کئے جن میں سے یہ دو اشعار میرے دل پر نقش ہو کر
رہ گئے ہیں:۔

"ہاں حُسن کے شکوے برحق ہیں یاں عشق میں کامل کوئی نہیں
بیکار ہیں جلوے ایمن میں، جلووں کا مقابل کوئی نہیں
اے راہ نوردِ راہِ طلب اس راہ کی ہے رفتار یہی
اٹھا جو قدم وہ منزل ہے کہنے کو منزل کوئی نہیں"

(۲)

بڑے دن کی تعطیل جس دن شروع ہوئی اسی دن میں سلیمان کے
علاقہ کو روانہ ہوا۔ وہ جس گاؤں میں رہتا تھا ضلع بستی میں اسٹیشن منڈیروا
سے دو میل دکھن تھا اور احمد پور کہلاتا تھا۔ میں نے سلیمان کو پہلے سے
اطلاع دیدی تھی اور وہ مجھے لینے کے لئے خود اسٹیشن آیا تھا۔ ہم
دونوں گھوڑے پر سوار ہوئے اور ساڑھے چھ بجے شام کو احمد پور

پہونچ گئے، سلیمان نے اپنے موروثی مکان سے الگ اپنے لئے ایک مختصر سا خوش وضع اور خوش منظر مکان بنوالیا تھا اور اسی میں سارے کنبہ سے بے نیاز ہو کر رہتا تھا، گھر پہنچتے ہی ہم لوگوں نے چائے اور ناشتہ تیار پایا سلیمان نے کہا:۔

"یہ سب ہمارے خدمتگار یا مہتمم میاں کریم کی خوش سلیقگی ہے"۔

کریم نے جو قریب ہی کھڑا تھا کہا "یہ سب سرکار کی جوتیوں کا طفیل ہے"۔

کریم کی عمر قریب قریب وہی تھی جو سلیمان کی بالیسری تھی۔ یعنی تیس بتیس سال کی، صورت سے خلوص، سنجیدگی اور تدبر کا اظہار ہوتا تھا مجھے اس کے حرکات وسکنات سے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ کریم اپنے آقا سے غیر معمولی طور پر بے تکلف ہے۔ اگرچہ گستاخی اور بے تمیزی کا اس میں شائبہ بھی نہ تھا۔

رات کو یہ طے ہو گیا تھا کہ پہلے تال کا شکار کھیلا جائے، چنانچہ دن نکلنے سے پہلے ہم لوگ تال روانہ ہو گئے جو وہاں سے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ کریم ساتھ تھا۔ راستہ بھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلیمان ایک ایک چپہ اور ایک ایک منظر سے نہایت گہرے اثرات قبول کر رہا ہے اس پر وہ ماتمی سکوت مسلط تھا جو صرف گزرے ہوئے زمانہ کی یاد پیدا کر سکتی ہے وہ خاموش تھا اور رہ رہ کر ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس بھر لیتا تھا

میں اس سے کچھ سوال کرنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے خود کہا۔

"مجھے اس اُجڑے دیار کے ایک ایک ذرّہ کے ساتھ عشق ہے اس کو مبالغہ نہ سمجھو۔ اگر میں کہوں کہ اس ویرانہ کو معمورۂ فردوس سے بھی بدلنے کے لئے میں تیار نہیں ہوں گا ایک ایک جھاڑی اور ایک ایک گوشہ سے بچپن اور جوانی کی نہ جانے کتنی یادیں وابستہ ہیں"۔

کوئی پوچھے کہ کیا یہ سرزمیں مجنوں کا مدفن ہے
چلی آتی ہیں شور انگیز یادیں اس بیابان سے"

جس وقت سلیمان نے یہ شعر پڑھا اسوقت ہم لوگ گھر سے کوئی تین فرلانگ نکل چکے تھے اور ایک قبرستان سے گزر رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سلیمان کے چہرے کا رنگ دمبدم بدل رہا تھا۔ کریم بھی میری طرح رہ رہ کر سلیمان کی صورت دیکھ رہا تھا۔ سلیمان نے یکایک کریم کو مخاطب کر کے کہا۔ "کیوں کریم! میں کیا غلط بات کہہ رہا ہوں؟"

کریم نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔ "سرکار سچ ہے جس جگہ انسان پیدا ہو کر پروان چڑھتا ہے اسکے ساتھ ایسی ہی محبت ہو جاتی ہے"۔

سلیمان نے مڑ کر کریم کو دیکھا۔ کریم نے بھی آنکھیں برابر کر کے دیکھا، اور دونوں آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہہ کر چپ ہو رہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ دونوں کے درمیان کوئی راز ہے لیکن اس وقت میں نے سلیمان کو چھیڑنا مناسب

نہیں سمجھا۔

جسوقت ہم لوگ شکار کے لئے کشتیاں لیکر تال میں اُترے تو سلیمان سب کچھ بھول چکا تھا اور شکار میں محو ہو گیا تھا، چار گھنٹے تک شکار کھیلتا رہا۔ تال چڑیوں سے بھرا پڑا تھا اور تین شکاریوں نے ملکر خوب شکار کیا۔

واپسی میں پھر سلیمان افسردہ و مضمحل ہو گیا تھا اور اُسکا سبب میں تھا چلتے چلاتے مجھے سُرخاب کا ایک جوڑا نظر آیا۔ میں نے بندوق سیدھی کی اور تاک کر جو چلائی تو ان میں سے ایک ہی گرا۔ میں خود اس فکر میں ہوا کہ دوسرے کو بھی ماروں مگر وہ زد سے نکل چکا تھا۔ سلیمان بیچین ہو کر کہنے لگا۔

"تم کیا جانو اور اگر جانو بھی تو اس کو کیا محسوس کرو کہ تم نے یہ کیا کیا، میں اسی لئے سُرخاب کا شکار کبھی نہیں کھیلتا۔ اب اس دوسرے کی زندگی تم نے ہمیشہ کے لئے دردِ سر بنا دی"۔

راستہ بھر سلیمان پر یہ اثر قائم رہا۔ میں نادم تھا لیکن مجھے حیرت بھی تھی۔ سلیمان شاعر تو فطرتاً تھا لیکن جس وقت وہ میرے ساتھ پڑھتا تھا اسوقت اسقدر دردمند نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس دوران میں کوئی ایسا واقعہ ضرور ہوا ہے جس نے اسکی حالت بدل دی ہے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں مبتلا ہو گیا تھا ورنہ سلیمان کی جھڑکیوں اور میری اپنی ندامت کے ہاتھوں میرا نہ جانے کیا حال ہوتا۔

(۳)

دن بھر اور رات بھر آرام کیا گیا اور دوسرے دن جنگل کے شکار کا ارادہ تھا۔ اس کے لئے ریل سے "بدیانگر" (ضلع گونڈہ) تک جانا پڑا، جہاں سے کچھ دور کے فاصلہ پر سلیمان کی اپنی زمینداری تھی ہم لوگ کوئی سات بجے کے قریب بدیانگر پہونچ گئے، سارا سامان ساتھ تھا، اسٹیشن ہی پر چائے پی گئی، اور پھر جنگل میں داخل ہو گئے۔ دوپہر تک کچھ معمولی شکار ہوا، اس کے بعد کھانا کھانے کے لئے اس گاؤں میں واپس آئے جہاں کریم ہم لوگوں کا انتظار کر رہا تھا کھانا مزیدار تھا اور سب بھوکے بھی تھے خوب سیر ہو کر کھایا، یہ میں برابر دیکھ رہا تھا کہ جو چیزیں سلیمان خود کھاتا ہے وہی کریم کو بھی کھلاتا ہے آج بھی یہی ہوا، میں دو دن سے سلیمان سے ان خلاف معمول باتوں پر سوالات کرنا چاہتا تھا۔ آج مجھ سے نہ رہا گیا، جب کھا پی چکے اور کریم ہٹ گیا تو میں نے کہا:-

"سلیمان دو سوالوں کا جواب دو۔ میں نے بہت چاہا کہ خاموش رہوں لیکن تمہارے ساتھ جب مجھے جو لگاؤ رہا ہے اُس سے میں اپنے کو مجبور پاتا ہوں کہ تم سے پوچھوں اور تمہارا جواب سنوں۔ تم شادی کیوں نہیں کرتے؟ دوسرے یہ کہ کریم تم سے اسقدر بے تکلف کیوں ہے؟ اور تم اس کا اس قدر خیال کیوں کرتے ہو؟....."

"ذرا صبر کرو" سلیمان نے بات کاٹ کر کہا۔ "میں خود تم سے بہت کچھ کہنے کے لئے بیتاب ہوں۔ گھر واپس چلو، آج رات کو اطمینان سے باتیں ہوں گی، تمہارے دونوں سوالات کا ایک ہی جواب ہوگا"۔

سہ پہر کو پھر تھوڑا سا شکار ہوا اور شام کی گاڑی سے ہم لوگ منڈیروا لوٹ آئے۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد کوئی دس بجے ہم لوگ اپنی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ کریم دن بھر ایسا تھکا تھا کہ اُسکی طبیعت کچھ بھاری ہوگئی اور وہ سلیمان سے اجازت لیکر معمول سے پہلے جاکر سو رہا۔

اب کمرے میں میرے اور سلیمان کے علاوہ کوئی تیسرا نہیں تھا سلیمان دیر تک کچھ غور کرتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کو چھیڑوں اور اس کو اس کا وعدہ یاد دلاؤں لیکن اُس نے خود کہنا شروع کیا۔

"تم کو حیرت ہے اور ہونا چاہیئے کہ کریم مجھ سے اتنا بے تکلف کیوں ہے اور میں اس کو اتنا کیوں مانتا ہوں۔ جمیل! کریم انسان نہیں فرشتہ ہے اور اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ ایسے صاحب دل اس کلجگ میں نہیں پیدا ہوتے، اگر یہ نہ بھی ہوتا تو بھی میرے اور اُس کے درمیان جو مقدس راز ہے وہ مجھے مجبور کرتا کہ میں اُسے نوکر کی طرح نہ رکھوں اور وہ راز یہ ہے"۔

میں سراپا شوق و انہماک ہوکر سُننے لگا۔

یہ داستان حسرت وحرماں اب سے دس سال پہلے سے شروع ہوتی ہے۔ میں علیگڈھ میں بی، اے میں پڑھتا تھا۔ ہاں یہ وہ زمانہ تھا جبکہ یورپ کی جنگ عظیم ختم ہونے والی تھی اور ساری دنیا نئے انقلابات کی متوقع تھی۔ کریم اُسوقت میرے والد مرحوم کا ہرکارہ (FACTO-TUM) تھا۔

تم جانتے ہو میں اپنے ماں باپ کا کیسا لاڈلا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے میں علیگڈھ سے بلایا جاتا اور کم سے کم سال میں چار بار مجھے یہاں ضرور آنا پڑتا تھا، ایک بار میں اسی بڑے دن کی تعطیل میں گھر آیا، اب کی بار میں نے گھر کی ماماؤں میں ایک نئی صورت دیکھی جو میری نگاہوں میں کھپ کر رہ گئی، وہ یتیم اور لاوارث تھی، میرے والد مرحوم اسکو نہ جانے کہاں سے لائے تھے اور میری والدہ نے اس کو اپنے نج کے کاموں کیلئے مخصوص کرلیا تھا اُس کا نام نجمہ تھا، تم اُسکی صورت کا نقشہ چاہتے ہو تو میں الفاظ میں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کو دیکھ کر بیساختہ درود پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ تم نے سعدی کا یہ شعر شاید سُنا ہو:۔

تعالے اللہ در حُسن تا غایتے

کہ پنداری از رحمت است آیتے

بس سمجھ لو کہ نجمہ بھی ایسی ہی تھی۔ مجسّم نور کی پتلی تھی، اُس نے پہلی ہی نگاہ میں میرے اندر ایک انتہائی ہیجان پیدا کر دیا اور مجھے یہ فکر ہوئی کہ

کسی طرح اس پر قابو پاؤں۔ تعطیل کا ایک ہفتہ گزر گیا۔ تین چار دن میں علیگڈھ
چلا جانے والا تھا، میری بے چینی بہت بڑھ گئی تھی، میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ
اب اس قلیل مدت میں چاہے کچھ ہو جائے اپنی پیاس بجھا کر رہوں گا۔ اُسی
دن شام کو نہ جانے کس ضرورت سے مکان کے اندر جا رہا تھا، ڈیوڑھی
میں اندھیرا تھا، اتنے میں اندر کا دروازہ کُھلا اور کوئی برآمد ہوا۔ مجھے معلوم
ہو گیا کہ یہ نجمہ ہے۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور چاہتی تھی کہ اندر واپس چلی جائے
میں نے دیوانہ وار لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو گود میں اٹھا لیا، اُس نے
بہت کہا۔ "چھوڑیئے، للّٰہ چھوڑیئے کوئی دیکھ لیگا تو آپ کو کیا کہے گا؟
یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ آپ کے لئے زیبا نہیں ہے"۔
میں اُس کا منھ چوم رہا تھا اور گرد و پیش سے بے خبر تھا۔ آخر کار مجھے
بھی خیال آیا کہ یہ راستہ ہے اور ابھی کوئی کسی طرف سے نکل آئے تو
کیا ہوگا؟ میں نے اُس کو گود سے اُتار دیا اور کہا۔
"نجمہ! آج رات کو جب سب سو جائیں تو میرے کمرے میں آؤ
مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں"۔
"یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے؟ دیکھئے میں آپ کی بہت زیادہ عزت کرتی
ہوں۔ میں آپ کو اس گھر میں سب سے اچھا آدمی سمجھتی ہوں، آپ ایسی باتیں نہ
کیجئے۔ خیر میرا رسوا ہونا اور نہ ہونا کیا۔ آپ خود بدنام ہو جائیں گے، میں اسکو

گوارا نہیں کر سکتی"۔

نجمہ نے نیچی نظر کئے ہوئے مجھے نیچا اونچا سمجھایا مگر مجھے کچھ نہ سوجھا۔

میں نے کہا۔ "دیکھو اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا اور آج میرے کمرے میں نہ آئیں تو پھر جب تک تم اس مکان میں ہو۔ میں ہرگز یہاں قدم نہ رکھوں گا ......"

نجمہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو میں اس مکان سے چلی جاتی ہوں"۔

"اور میں پھر کل ہی علیگڑھ چلا جاتا ہوں، لوگ مجھ سے اس کا سبب پوچھیں گے تو میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ نجمہ کے چلتے بھاگا جا رہا ہوں۔ دیکھنا میں کل خود اپنے کو رسوا کر دوں گا اور تمھیں اپنی رسوائی کی تو پروا ہے نہیں؟"

"میری رسوائی ہی کیا؟" نجمہ نے جواب دیا اور فوراً ہاتھ چھڑا کر مکان کے اندر ہو رہی۔

اس رات کو میں بارہ بجے تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ نجمہ نے آنیکا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ مگر میں انتظار کر رہا تھا اور میرا انتظار بیکار نہیں گیا، کوئی ایک بجے کے قریب نجمہ دبے پاؤں میرے کمرے میں داخل ہوئی اور میں نے دوڑ کر اس کو آغوش میں لے لیا۔

نجمہ نے کہا اور بڑے تیور کے ساتھ۔ "دیکھئے میں صرف اس خیال سے

آئی ہوں کہ آپ ایک یتیم بھکارن کے چلتے اپنا گھر کیوں چھوڑیں اور ذراسی بات کے لئے پاگل ہو کر اپنے آپ کو رسوا کیوں کریں۔ میں نے آپ کا اتنا خیال کیا .... آپ کم سے کم میرا اتنا خیال کیجئے کہ مجھے کوئی بیسوا نہ سمجھئے "

جمیل اس کے بعد میری ہمت نہ ہوئی کہ اسکے پندار عصمت کو غارت کرتا۔ میرا دعوی ہے کہ اگر نجمہ کو تعلیم و تربیت دی گئی ہوتی تو وہ لاکھوں میں ایک تھی، ورنہ اس رات کو مجھ پر فتح پانا ہر عورت کا کام نہ تھا، میں نادم ہو کر کہنے لگا :۔

" نجمہ تم چیز ہی ایسی ہو کہ انسان تم کو دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھے خیر تم مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں تمھیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا، لیکن میری اچھی نجمہ! منھ تو چوم لینے دو یا یہ بھی نہیں "

نجمہ کو اس میں کوئی عذر نہیں تھا میں نے اُس کا منھ چوما اور دیر تک چومتا رہا۔ اسکے بعد وہ چلی گئی اور ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ اس کے بعد میں کئی بار علیگڈھ سے گھر آیا اور برابر یہی ہوتا رہا کہ نجمہ بس مجھے بوس و کنار کی اجازت دیدیتی تھی اور میں تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گرمی کی چھٹیاں بھی یوں ہی گزر گئی تھیں، اب اگر کبھی میرے دل میں کچھ اور خیال آتا اور میرا حوصلہ کچھ اور اس سے آگے بڑھتا تو میں خود

شرما کر رہ جاتا تھا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ مجھ سے اُس سے آخری ملاقات پھر بڑے دن کی تعطیل ہی میں ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ اگلی بار جب میں نے اُس کو پیار کیا تھا تو اُس نے نہایت افسردہ لہجہ میں کہا تھا کہ :۔

"آخر آپ کب تک اس طرح مجھ سے کھیلتے رہیں گے"؟

میں اسوقت اس کے معنی نہیں سمجھ سکا تھا۔ آہ! کاش اُس نے اسقدر ضبط اور خودداری سے کام نہ لیا ہوتا۔

اس کے بعد میں پھر گرمیوں کی لمبی چھٹیوں میں یہاں آیا اور مجھے معلوم ہوا کہ میرے والدین نے نجمہ کی شادی کریم سے کر دی ہے۔ کریم پروانہ کی طرح روز اول سے نجمہ پر جان دیتا تھا لیکن نجمہ کو اُس کے ساتھ کوئی خاص اُنس نہیں تھا۔ آخر کار کریم نے میرے والد سے اپنا ماجرائے عشق بیان کر دیا اور ان سے درخواست کی کہ نجمہ کو اُس کے نکاح میں دیدیا جائے۔ والد کو کوئی اعتراض نہیں تھا، انھوں نے میری ماں سے مشورہ کیا۔ ماں بھی راضی اور نجمہ کریم کی چیز ہوگئی۔

جمیل! انسان کے جذبات اور کم سے کم جذبات عشق کا کوئی اعتبار نہیں مجھ پر اس خبر کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا، کچھ دنوں تک مجھے وہ لذتیں یاد آتی رہیں جو میں نے نجمہ سے حاصل کی تھیں اور بس! پھر کچھ نہ تھا، میں تم لوگوں کے ساتھ وہی شاعر اور ادیب سلیمان تھا جو امتحانات میں امتیاز پر

امتیاز حاصل کر رہا تھا۔

اس کے بعد میں جب آیا تو یہی سُنا کہ نجمہ بیمار ہے اور کریم پریشان ہے نجمہ پر مجھے ترس آتا تھا بالکل اسی طرح جس طرح کسی اور غریب و نادار کو بیمار سُن کر اس پر ترس آجاتا ہے اتنی بھی مجھے توفیق نہ ہوئی کہ کبھی جا کر یا بلا کر دیکھ لیتا میں اس کی طرف سے بالکل بےحس ہو گیا تھا۔

آخر کار جب میں ایم' اے پاس کر کے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ نجمہ مر گئی۔ میں ایک بار بےچین ضرور ہو گیا لیکن یہ بےچینی بھی دیرپا نہیں تھی اور چونکہ ابھی ماں باپ کا غم تازہ تھا اس لئے اور بھی نجمہ کی موت کا کوئی خاص احساس نہیں ہوا۔

کریم کو اپنے باپ کی یادگار سمجھ کر میں نے اپنی خدمت میں لے لیا تھا ایک روز رات کو کریم مجھے کھانا کھلا رہا تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں رہا ہے۔ میں نے کہا۔

"کہو کریم! تمھیں کچھ کہنا ہے؟"

کریم نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ جی ہاں! مگر میری ہمت نہیں پڑتی شاید آپ کو ناگوار ہو۔ مگر میں مجبور بھی ہوں"۔

میں نے فوراً اُس کا دل بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں کہو بات کیا ہے"؟

کریم نے رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔

"میں مرنے والی کی وصیت سے مجبور ہوں۔ یہ امانت مرتے وقت میری چہیتی بیوی نے میرے سپرد کی تھی کہ میں اس کو آپ تک پہنچا دوں، آپ شاید اِس کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں"۔

میں کریم کا منھ دیکھ رہا تھا اور میرا دل دھڑکنے لگا۔ لیکن میں نے کہا۔ "کریم کہہ بھی ڈالو"۔

کریم نے کہا۔ "میری بیوی نے مرتے دم مجھ سے اقرار کیا کہ اُس نے جس تاریخ سے آپ کو دیکھا تھا اسی تاریخ سے آپ نے اسکے دل میں جگہ کر لی تھی اور رفتہ رفتہ آپ کا دم بھرنے لگی تھی۔ وہ اس اُمید میں تھی کہ آپ اسکی محبت کی قدر کریں گے اور اس کو قبول کر لیں گے لیکن آپ اُس سے اپنی ہوس پوری کرنا چاہتے تھے اور جب وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئی تو آپ اُس کو کچھ دنوں تک پیار کر کے رہ گئے اور پھر اس کو بھول گئے۔ وہ بہرحال آخری سانس تک آپ کو نہیں بھولی۔ آپ نہیں جانتے اور نہ آپ نے کبھی اس طرف توجہ کی کہ وہ دل و جان سے آپ کی ہونا چاہتی تھی اور صرف آپ کی ہو کر رہنا چاہتی تھی، وہ بیوقوف اور ناتجربہ کار تھی اور اس خواب میں بھولی ہوئی تھی کہ کبھی نہ کبھی اس کی محبت اپنا اثر دکھائیگی اور آپ اس سے اسقدر محبت کرنے لگ جائیں گے کہ

نہیں جو کسی دوا یا دعا سے اچھا ہو سکے، میری موت سر پر آ گئی ہے، اب میں تم
سے اپنے دل کی بات کہتی ہوں جس کو سُن کر شاید تمھارے دل کو دھکّا لگے
مگر میں گنہگار نہیں ہوں اور اگر ہوں تو مجھے معاف کر دینا اور کسی
خیال سے نہیں تو صرف اس خیال سے کہ میں اب پھر دنیا میں تمھاری
یا کسی اور کی گنہگار بننے نہیں آؤں گی۔"

یہ کہہ کر اُس نے یہ ساری باتیں مجھ سے بیان کر دیں اور کہا:۔
"دیکھو اس کو حرف بحرف سلیمان میاں کے کانوں تک پہنچا دینا۔
یہ میری وصیّت ہے اور یہ میری امانت ہے، میں تم سے نادم نہیں ہوں
اس لئے کہ مرتے دم تک تمھاری بیوی رہی اور کبھی تمھارے ساتھ دغا
نہیں کی۔ تم سے شادی ہونے سے پہلے بھی میں سلیمان میاں کو چاہتی
ضرور تھی لیکن میرا خدا گواہ ہے کہ اُن سے کسی قسم کا ناجائز تعلق کبھی نہیں رہا
انھوں نے کبھی کبھار مجھے پیار ضرور کر لیا ہے اور میں نے ان کو پیار کر لینے
دیا ہے اس سے زیادہ کی گنہگار نہیں، اور اگر ذرا دیر کے لئے یہ سوچو کہ
میں اپنے دل میں کیسی آگ دبائے رہی ہوں تو یہ کوئی گناہ نہیں معلوم ہوگا
بس جاؤ اور میری وصیت کو نہ بھولنا۔"

یہ کہہ کر اس نے آخری سانس لی اور پھر؟ . . . .
پھر میں اُس کو لیجا کر زمین کے نیچے دبا آیا۔ اس کے بعد میرا کیا حال رہا؟

اس کے خواب کو سچ کر دکھائیں گے، سُنا وہ آپ کی وفادار اور خدمت گزار بیوی بننا چاہتی تھی۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا تھا، مگر خیر وہ اب نو من مٹی کے نیچے دبی پڑی ہے اس کو پاگل کیا کہئے۔ خلاصہ یہ کہ زمانہ نے بہت جلد اس کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے دیکھ لیا کہ اسکی قسمت میں مجھ بدبخت کی بیوی بننا تھا، میں اسکی محبت میں اندھا ہو رہا تھا، میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ دوسرے کا غم لئے ہوئے ہے۔

لوگوں نے میری خواہش دیکھ کر اُس کے ساتھ میری شادی کر دی، اور اس میں شک نہیں کہ مرتے دم تک وہ میری فرمانبردار بیوی رہی لیکن اسکا دل آپ کی محبت کی آگ میں سلگ رہا تھا اور اسی آگ میں آخر کار وہ جل کر راکھ ہو گئی لیکن نہ تو کبھی وہ اپنے بیوی ہونیکے فرائض کو بھولی اور نہ آپکی محبت کے بھید کو کسی پر ظاہر کیا۔ جس دن سے وہ بیاہ کر میرے پاس آئی اسی دن سے مجھے وہ سوگوار نظر آ رہی تھی، میں نے کئی بار اس کے ملال کا سبب پوچھا مگر اس نے ہمیشہ "کچھ نہیں" کہہ کر ٹال دیا۔ آخر کار وہ بیمار رہنے لگی۔ میں نے بہت دوڑ دھوپ کی اور اس کے علاج میں بہت سر مارا لیکن سب بیکار"۔

"جب اُسکے مرنے کی گھڑی قریب آئی تو اُس نے مجھے بلا کر کہا۔

"تم ناحق میری دوا کے پیچھے حیران و سر گرداں ہو، مجھے وہ عارضہ

سو اس کے حال کے آگے میرا حال بھی کوئی حال ہے جس کو بیان کیا جائے، اسی دن سے میں اپنے دل پر اس کی وصیت کا بار محسوس کر رہا تھا، آج خدا خدا کر کے وہ بار ہلکا ہوا۔"

کریم خاموش ہو گیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ اُس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ خود کو مجھ سے برتر ہستی سمجھ رہا ہے اور مجھے خود احساس ہو گیا کہ وہ مجھ سے بہت بلند و برتر ہے۔

اس دن سے آج تک ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا کہ نجمہ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے نہ پھرتی ہو۔ میں نجمہ کی موت ثابت ہوا، اور وہ مجھ پر جان دیتی تھی۔ اللہ اللہ! کس چیز کا بدلہ اُس کو کیا ملا۔ محبت کا بدلہ موت! جتنی عبرت ہو کم ہے۔

اسی دن سے میں کریم کو اتنا عزیز رکھنے لگا ہوں، میں اس کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ میں ہر لمحہ خود کو اس کا گنہگار سمجھتا ہوں۔ اور اس کے تیور ہر وقت بتاتے رہتے ہیں کہ اُس نے مجھے معاف کر دیا ہے اور معاف کرنے کے لئے تیار ہے۔

جمیل! اب میرے دل میں اتنا حوصلہ نہیں کہ شادی کر کے بیوی گھر میں لاؤں اور چین سے رہوں۔ خیریت یہ ہے کہ میرے ماں باپ نہیں رہے ورنہ میں اس طرح بھی چین سے نہ رہ پاتا۔ وہ

ضرور میری شادی کرتے۔ یہاں تو شادی ماں باپ یا سرپرست کرتے ہیں۔ اب آگے چل کر چاہے وہ شادی "خانہ آبادی" ثابت ہو، یا "خانہ بربادی"۔

یہ کہہ کر سلیمان نے کہا:۔

"اس وقت میں بہت بےچین ہوں۔ نجمہ کے مزار پر جا کر دو آنسو بہا لوں تو بڑا سکون ہوگا۔ میں نے کریم کے ذریعہ اس کی قبر پختہ بنوادی ہے اگر تم بھی چاہو تو ساتھ چل کر دیکھ آؤ"۔

میں ساتھ ہو لیا۔ سلیمان اسی قبرستان میں پہونچا، جس میں سے کل ہم لوگ گزرے تھے۔ سلیمان ایک پختہ اور صاف ستھری قبر کے سامنے بیٹھ گیا۔ جس کی لوح پر "دل جلی نجمہ" کندہ تھا۔ سلیمان دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ یہ سماں کچھ ایسا غم انگیز تھا کہ میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔

رات کا پچھلا پہر گزر رہا تھا۔ سلیمان سے میں نے کہا:۔

"اب بس کرو، اٹھو اور گھر چلو، صبح ہو رہی ہے"۔

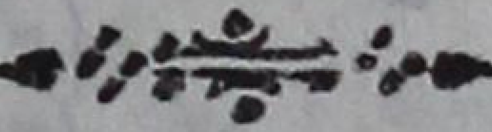
سلیمان نے میری بات مان لی، اور اٹھ کھڑا ہوا۔ راستہ میں کہنے لگا:۔

"یہ میری اور نجمہ دونوں کی آرزوؤں کا مدفن ہے"۔

اس کے بعد اس نے جس اندوہ ناک لہجہ میں یہ شعر پڑھا وہ مجھے ہمیشہ یادگار رہے گا:۔

"چوں بگزرد نظیریِ خونیں کفن بہ حشر
خلقے فغاں کنند ایں داد خواہ کیست؟"

۱۹۳۱



بیگانہ

(۱)

صورت اور حرکات و سکنات سے ہر شخص اس کو پاگل کہہ دیتا اور ہم لوگوں نے تو اس کو پاگل ہی سمجھ لیا تھا۔ ہم لوگوں کو یقین تھا کہ وہ بغیر ٹکٹ سفر کر رہا ہے۔ ورنہ ایسے خرقہ پوشوں کا سکنڈ کلاس میں کہاں گزر، بال پریشان، حجامت بڑھی ہوئی، ناخن گندے، شاید مہینوں سے نہیں کٹے تھے، آنکھوں میں حلقے پڑے تھے، ہونٹ سوکھے ہوئے تھے، گال بیٹھے ہوئے تھے، برسوں کا بیمار معلوم ہوتا تھا، کرتے اور پاجامہ کے سوا اُس کے بدن پر کچھ نہ تھا۔ کرتے کی یہ حالت کہ کہیں سے آستین نکلی ہوئی، کہیں سے دامن مسکا ہوا، پائجامہ بھی کچھ اس سے بہتر حالت میں نہ تھا۔ لیکن جس بات نے ہم لوگوں کو سب سے زیادہ حیرت میں ڈال رکھا تھا وہ یہ تھی کہ اُس کو سردی کا احساس مطلق نہ تھا، حالانکہ دسمبر کا مہینہ تھا اور اندھیرا ہو چکا تھا۔ سامان ہی اسکے پاس کیا تھا کہ ایک چھوٹی سی میلی کچیلی گٹھری جس میں نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کیا ہے۔ الغرض کچھ عجیب دھج تھی

اور عجیب تیور تھے۔

ہم لوگ بنارس سے لکھنؤ آرہے تھے، پرتاب گڈھ کے اسٹیشن پر گاڑی رکی اور ہم لوگوں کے ٹکٹ کا معائنہ ہونے لگا۔ اس پیکرِ وحشت نے بھی ایک ٹکٹ گٹھری کے ایک کونہ سے نکال کر پیش کر دیا اور سب کے سب اس کا منھ تکنے لگے، گاڑی چلی اور ہم لوگ پھر گفتگو کے طوفان میں اپنے انوکھے ہمسفر کو بھول گئے۔ ہم انگریزی میں باتیں کر رہے تھے اور اسقدر بلند آواز کے ساتھ کہ بغل والے خانہ کے مسافر بھی حرف بحرف سُن سکتے تھے۔ لیکن ہمارے حواس باختہ پر اس کا کوئی اثر نہ تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گرد و پیش کی دنیا سے بہت دور کسی دوسری دنیا میں کھویا ہوا ہے، وہ بظاہر نہ کچھ دیکھ رہا تھا اور نہ سُن رہا تھا، کھڑکی سے باہر خلا میں اسکی نگاہیں محو تھیں اگر ہم لوگوں نے پہلے ہی سے اس کو ہوش و حواس سے عاری نہ سمجھ رکھا ہوتا تو یہ سمجھتے کہ یہ شخص کسی گہرے سوچ میں ہے اور اسکو چونکا کر ہوشیار کرنا دشوار ہے۔

ہم تین آدمی تھے۔ تینوں ہمخیال، ہم سن، ہم نوالہ، ہم پیالہ اور پھر ہم پیشہ، یعنی تینوں ایک ہی کالج میں پروفیسر تھے، آپ سمجھ سکتے ہیں جب ایسے احباب یکجا ہوتے ہیں تو پھر ساری دنیا ہیچ ہو جاتی ہے۔ کون سا ایسا مسئلہ تھا جس پر ہم لوگوں نے بحث نہیں کی اور جس کو حل

نہیں کر ڈالا۔ سفر کا مونس سگریٹ ساتھ تھا اور فلسفہ، شاعری، معاشیات، سیاسیات، غرض کہ زندگی کے تمام مسئلے اپنی تیز و طرار زبان کے ماتحت تھے، سارے قضیے طے ہو گئے تو محبت اور زندگی پر مابعد الطبیعیاتی بحث چھڑ گئی۔ مجھ کو شیلے کی وہ مختصر نظم یاد آ گئی جس میں اُس نے محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے، میں نے کہا:۔

"زندگی کا راز الفت ہے، اگر الفت نہ ہوتی تو آج کائنات میں کوئی نظام نہ ہوتا اور سوا انتشار و پراگندگی کے کہیں کچھ نہ ہوتا، بڑے سے بڑا مادہ پرست بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔"

اس پر میرے دوستوں میں سے ایک نے حافظ کا یہ شعر پڑھا ؎

دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند
گِلِ آدم بہ سرشتند و بہ پیمانہ زدند

یوں تو محبت کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں ہے۔ لیکن آدمی کی سرشت محبت ہے۔ محبت آدمی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔

اس پر ہمارے مسافر نے پہلو بدلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سکون میں خلل پڑ گیا ہے اور اب وہ بے چین ہے۔ اُس نے ایک بار ہماری طرف دیکھا اور ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ منہ پھیر کر کہا:۔

"چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند"

ہماری حیرت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ دیر تک ہم دم بخود اس کو دیکھتے رہ گئے۔ اس نے بغیر ہم کو مخاطب کئے ہوئے خود بخود انگریزی میں کہنا شروع کیا:۔

"زندگی اور محبت! اس میں شک نہیں کہ بڑے دلفریب نام ہیں مگر اس سے آگے ان کی حقیقت، زندگی ایک فریب، محبت ایک طلسم موت، تاریکی، نفسانیت، یہ ہے اس چیز کی اصلیت جس کا نام "نظام کائنات" رکھا گیا ہے"۔

ہمارے فرشتوں کو بھی گمان نہ تھا کہ گدڑی میں ایسا "لعل" نکلے گا، ہیں اپنی حیرت پر قابو پا گیا تھا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس نے خود ہماری طرف متوجہ ہو کر معذرت کے ساتھ کہا:۔

میں نے بیجا مداخلت کی ہے اگر آپ حضرات کو ناگوار ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیجئے، اگر آپ لوگ محبت اور زندگی کی بے معنی بحث نہ چھیڑ دیتے تو شاید عمر بھر میرے ساتھ سفر کرتے رہ جاتے اور آپ کی بکواس کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا، میں جہاں ابتک تھا وہیں ہمیشہ رہتا۔ اب اگر مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی ہے جو آپ کے نزدیک غیر مہذب، یا بے محل ہے تو اس کے ذمہ دار خود آپ ہیں، ہاں مجھے اعتماد ہے اور تجربہ و مشاہدہ نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ زندگی موت کا ایک کھیل ہے محبت نفس کا ایک دھوکا ہے

آپ لوگوں کو یہ توقع نہ تھی کہ میں اس قسم کا آدمی نکلوں گا، آپ مجھے کوئی دیوانہ یا کوئی جاہل گنوار تصور کر رہے تھے۔ خیر ممکن ہے میں وہی ہوں جو آپ نے سمجھ رکھا تھا مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے بھی کبھی اپنا وقت ادبیات و فلسفہ میں گزارا ہے اور زندگی کے مسئلوں پر غور کیا ہے مگر اب تو میں ہوں اور ایک عالم گم گشتگی، کسی مسئلہ پر غور کرنا تو درکنار اب یہ بھی نہیں سمجھتا کہ یہ اپنی کیا حالت ہو رہی ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی"

زیادہ تر وہ انگریزی میں باتیں کر رہا تھا، زبان ایسی ستھری اور دلفریب کہ ہم تینوں کو اس "غبار ناتواں" پر رشک آنے لگا۔ وہ اب خاموش تھا لیکن چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ بےچین ہے اور کسی اندرونی شورش کو دبا ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم لوگ انتظار کر رہے تھے کہ ابھی وہ کچھ اور کہے گا مگر وہ چپ رہا۔ مجبوراً میں نے اس مہر سکوت کو توڑنے کی غرض سے کہا:۔

"کیا ہم لوگ آپ کا نام جان سکتے ہیں؟ اگر گراں نہ گزرے تو بتائیے کہ آپ کون ہیں اور آپ کی زندگی میں کیا ایسے ناموافق واقعات پیش آئے جن کی بناء پر آپ نے یہ کلیہ قائم کیا ہے؟"

اس نے کہا۔ "بس اتنا بہت ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں، میں

واقعی آپ کی دلچسپ گفتگو میں خلل انداز ہوا"۔

"بالکل نہیں"۔ میرے ایک دوست نے بات کاٹ کر جواب دیا "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم کو ایک ایسا شخص ہمسفر مل گیا جو ان مسائل پہ اظہار خیال کر سکتا ہو، اور اگر آپ اپنا تعارف ہم لوگوں سے کرا دیں تو پھر زہے نصیب"۔

"میں کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ ہوں تو بتاؤں بھی، اور اگر کچھ ہوں بھی تو خود مجھے خبر نہیں کہ میں کیا ہوں، قصہ مختصر یہ کہ انسان ہوں، ہاں اسی آدم کی نسل سے جسکا خمیر آپ لوگوں کے کہنے کے مطابق عشق سے ہوا ہے۔ اس سے آگے مجھے خود نہیں معلوم کہ کیا ہوں"؟

ہم میں سے کسی کو اب اور کسی بات کا ہوش نہ تھا تینوں اُس شاعر وحشی میں محو ہو گئے تھے۔ میں نے پوچھا:۔

آخر کچھ تو بتائیے کہ آپ کون ہیں، کیا کرتے ہیں؟ کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں جائیں گے"؟

اُس نے کہا۔ "میں صرف آپ کے آخری سوال کا جواب آسانی سے دے سکتا ہوں۔ اسوقت میں لکھنؤ اتر دوں گا"۔

"کہاں قیام ہو گا"؟

اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "دیکھئے کہاں قیام ہوتا ہے اب تک

تو خبر نہیں کہ رات کہاں کٹے گی"۔

میں نے کہا" تو کیا غریب خانہ کو سرفراز فرما سکتے ہیں؟ امید ہے کہ آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی"۔

اُس نے جواب دیا" مجھے انکار نہیں۔ لیکن آپ لوگوں کو بڑی تکلیف ہوگی"۔

میں نے فوراً جواب دیا" ہرگز نہیں، ہماری سب سے بڑی مسرت یہ ہوگی کہ آپ ہمارے مہمان ہیں"۔

اس نے کہا" خیر! مجھے کوئی عذر نہیں لیکن اتنا واضح رہے کہ رات بھر سے زیادہ میں آپ کا مہمان نہیں رہوں گا، صبح کو میں آزاد رہوں گا کہ جہاں چاہوں جاؤں اور جہاں چاہوں رہوں"۔

اس کے بعد اس نے بڑے اثر کے ساتھ یہ شعر پڑھا۔

"نہ ملا ہے نہ ملے گا مجھے آرام کہیں
عمر گزری ہے یونہی صبح کہیں شام کہیں"

(۲)

یہ ایک رات کا مہمان ہم کو عمر بھر یاد رہے گا۔ بڑی دیر تک تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے، آخرکار اسکے قیافہ اور حرکات و سکنات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہم لوگ اس

نتیجہ پر پہونچے کہ اس سے عقیدتمندانہ ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیئے کیونکہ
وہ پورا مجذوب تھا اور اگر ذرا بھی دنیا داری برتی جاتی تو ساری رات
یونہی گزر جاتی اور وہ راہ پر کبھی نہ لگتا اور نہ کبھی اپنی سرگزشت سُناتا۔
ہمیں یہ فکر تھی کہ وہ کسی طرح اپنا ماجرا سنائے۔ مگر وہ غیر متعلق باتوں
سے ہم کو بہلاتا رہا۔ اس طرح کوئی رات کے دس بج گئے۔ کھانا آج
معمول سے زیادہ دیر میں کھایا گیا۔ اُس نے برائے نام کھایا اور دسترخوان
سے ہاتھ کھینچ لیا۔ معلوم ہوا اس کی یہی خوراک ہے۔
گیارہ بجے کے قریب اُس نے کہا۔ "اگر زحمت نہ ہو تو ایک بار
اور چائے پلائیے"۔
ہم لوگوں نے برقی چولھے پر اپنے ہاتھ سے چائے تیار کی۔ اُس نے
کہا۔ "آپ لوگ واقعی دردمند دل رکھنے والے ہیں، ورنہ آپ کو کیا پڑی ہے
جو ایک خاک بسر شوریدہ حال دربدر کی ٹھوکر کھانے والے کے ساتھ ایسی
ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ میں آپلوگوں کے خلوص کا دل سے قائل ہو گیا
ہوں لیکن اس کا بدلہ میں کیا دوں، میرے پاس کیا ہے اور میں کس لائق
ہوں، آپ میری زندگی کی داستان سننا چاہتے ہیں۔ میں نے بہت چاہا
کہ ایک چپ میں ساری بلا ٹال دوں اور کسی کے سامنے اپنے کو رسوا
نہ کروں۔ مگر اب میں اپنے کو مجبور پاتا ہوں کہ آپ کی خاطر تھوڑی دیر کیلئے

دیوانگی چھوڑ کر ہوش میں آجاؤں، مگر آخر آپ لوگ کیا سننا چاہتے ہیں؟
اور میں آپ کو کیا سناؤں؟

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

اگر یہ اجمال کافی نہیں ہے تو اور سنیئے"۔

ہماری منھ مانگی مراد مل گئی۔ من کی موج تھی وہ خود اپنا ماجرا سنانے کے لئے تیار ہو گیا تھا، اس سے بڑھ کر ہماری خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی! سب سراپا گوش ہو گئے۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

"یوں تو بچپن ہی سے کچھ میری اُٹھان ایسی رہی اور ماحول ایسا تنگ و تاریک اور دم گھٹانے والا تھا کہ میں زندگی کو کردہ یا ناکردہ گناہوں کی سزا ماننے پر مجبور تھا۔ آگے پیچھے جدھر نظر اٹھتی مصیبت و ابتلا کا دھندا تھا معلوم ہوتا تھا کہ سکون راحت کسی کے مقدر کی چیز نہیں۔ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ غم ہے، ہر شخص کو کسی نہ کسی بات کا رونا، یہ تھا میرا روز کا مشاہدہ' پھر اگر میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جینا ایک قسم کا دردِ سر ہے تو کیا غلط تھا؟

میں کمسنی میں یتیم ہو گیا تھا، میرے چچا جو کسی حد تک خوشحال تھے میرے مربی ہوئے اور انٹرنس تک مجھے پڑھایا۔ عربی، فارسی میں انہیں کے زیرِ دامن خاصی مہارت حاصل کر لی تھی، میں ان کے احسانات کبھی نہ

بھولوں گا، مگر انٹرنس کے بعد وہ بھی میرا بار نہ برداشت کر سکے اور پھر مجھے چھوڑ دیا گیا کہ جہاں چاہوں جاؤں اور اپنے فلاح کی جو صورت نکال سکوں نکالوں، اب میری مثال اُس سفینہ کی تھی جس کو کشتی بان کسی طوفانی سمندر میں چھوڑ کر چلا جائے۔ میں فطرتاً شاعر تھا، اُردو، فارسی کے مشہور شعراء کے کلام میری زبان پر تھے، چودہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگا تھا۔ مذاق اچھا تھا، مطالعہ وسیع تھا اس لئے اچھا کہتا تھا، تخلص بیگانہ تھا اور آجتک میرے اکثر جاننے والے مجھے اسی نام سے جانتے ہیں، شعر و سخن میں میں نے تھوڑا بہت نام بھی پیدا کیا، جی ہاں! آپ کا خیال صحیح ہے کبھی کبھار میرے خرافات رسائل اور اخبار میں چھپتے بھی رہے ہیں، میں شروع سے شعر اچھا کہتا تھا، اس وقت میری عمر بتیس سال کی ہے، اب سے کوئی پندرہ سال پہلے کے اشعار سنیئے:۔

وہ اور عدو سے وفا کرینگے، وفا کرینگے وفا کریں گے
یہ ہم سے پوچھو کہ زندگی بھر خراب عہدِ وفا رہے ہیں

یا یہ شعر سنئے:۔

رقیب بہر عنایت، رقیب بہر کرم
گناہگار یہی خانماں خراب اُن کا

اس سے غالباً دو تین سال بعد کا یہ شعر ہے:۔

ہونٹ ہے لب پر تو کلیجے سے لگی ہے تصویر
کفر آیا ترے وحشی کو نہ اسلام آیا

میں بھی اپنی وحشت کی رَو میں موضوع سے کتنی دور ہٹ گیا۔ کہنے کا یہ مقصد تھا کہ میں شاعر تھا اور شاعر کے خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ وہ نہ ہمیشہ ملول و غمگیں رہ سکتا ہے، نہ ہمیشہ شگفتہ و بشاش کبھی اگر زندگی کی صعوبتوں سے عاجز آکر وہ یہ کہہ اُٹھتا ہے کہ :۔

"ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے"

تو کبھی کبھی مدہوش ہو کر یہ نعرہ بھی لگانے لگتا ہے

مبارک مجھ کو بھی کیف آشنائے سوز ہو جانا
مبارک داغہائے دل کو دل افروز ہو جانا

یہ میری ایک نظم کا شعر ہے جس کا عنوان "شاعر کا پیغام" تھا۔ دیکھیے پھر میں بہک چلا۔ قصّہ مختصر جوانی کی عمر تھی۔ رگوں میں اُپج تھی، دل میں حوصلہ تھا، گھر چھوڑا تو سیدھا علیگڈھ پہنچا، یتیموں، اور لاوارثوں میں میرا شمار کیا گیا اور میں نے صرف اپنی اپج کی بدولت اور اپنے بل بوتے پر وہاں سے بی۔اے پاس کیا۔ جب تک وہاں تعلیم پاتا رہا اُستادوں اور ہمچشموں میں ممتاز رہا، وسعت مطالعہ اور دقّت نظر کی بدولت میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، انگریزی اور اُردو دونوں میں میری طرز انشا قابل تقلید

سمجھی جاتی تھی۔ میں اپنے ذاتی رسوخ کی بدولت اگر چاہتا تو کسی بڑے
سرکاری عہدہ پر مامور ہو جاتا مگر میرے اندر آزادی اور خود روی کا جذبہ ضرورت
سے زیادہ تھا، میں کسی کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ اُسی زمانہ میں لکھنؤ کے
ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر نے (خدا اُن کا بھلا کرے) مجھے ترغیب
دی کہ میں لکھنؤ آؤں اور اس اخبار کی ادارت میں اُن کی مدد کروں، میں
معاون مدیر بنایا گیا۔ اس سے زیادہ وقار اور اعزاز میرے لئے اور کیا
ہو سکتا تھا؟ اب یہاں سے میری زندگی نے بُری طرح پلٹا کھایا۔

چائے کا دور جاری تھا۔ بیگانہ پیالی پر پیالی خالی کر رہا تھا اور اُس کا
جی بھرتا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے ایک پیالی اور مانگی اور سلسلہ شروع کیا۔
اب تک عورت اور محبت کا مجھے کوئی ذاتی تجربہ نہیں تھا، میں
بڑی سلامت روی کی چال چل رہا تھا قدم پھونک پھونک کر رکھتا تھا کہ کہیں
کسی تازہ آفت میں نہ پڑ جاؤں اور پھر کہیں کا نہ رہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ان
مصروفیتوں اور دلچسپیوں سے بالکل ناآشنا رہا۔ جن میں میرے اکثر ہمجولی
اپنے اوقات ضائع کرتے رہتے تھے لیکن شاعری مجھے بتا چکی تھی کہ
محبت کیا ہے اور میں محبت کو ایک اچھی چیز سمجھتا تھا، ہاں یقین مانیے میں بھی
آپ لوگوں کی طرح محبت کو ایک کیمیا سمجھتا تھا جس کا حاصل کرنا انسان کی زندگی کا

اصل مقصد ہے اور جو زندگی کی ہیئت اور ماہیت دونوں کو بدل دیتی ہے
یہ سچ ہے کہ میں زندگی کو کسی حلوقہ کی غارت گری سمجھتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ
یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس رائشش اور اُسکی غارت گریوں سے اگر پناہ مل سکتی ہے
تو محبت کے ہاتھوں ۔ حاتم کا یہ شعر میں اکثر پڑھا کرتا تھا :-

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

میرا عقیدہ تھا کہ یہ سارا "دردِ سر" "پیا" کے نہ ملنے تک ہے "پیا"
مل جائے تو "دردِ سر" بھی کیف و سرور ہو جائے میں محبت کو "ھُوَ الاَوَّل
ھُوَ الآخِر" سمجھے ہوئے تھا، دونوں جہان "مَتَاعُ الغُرُور" ہوں تو ہوں
مگر محبت ایک مقدس حقیقت ہے جو زندگی کو بھی ایک حقیقت بنائے
ہوئے ہے یہ تھا میرا فلسفہ ۔

میں لکھنؤ میں بڑی فراغت اور شادمانی کی زندگی بسر کر رہا تھا ۔
ڈیڑھ سو ہر مہینے جیب میں آتے تھے ۔ کسی دوسرے کا بار اپنے سر نہ تھا
اکیلے دم کے لئے یہ ماہانہ رقم ایک خاصی دولت تھی ۔ میں اپنی قلمرو کا گویا
مطلق العنان بادشاہ تھا، کچھ احباب تھے جن کی صحبت میں دنیا اور
دنیا کے آلام کو بھولا ہوا تھا لیکن آخر کار وہ گھڑی آئی جس نے مجھے
ایک فردوسی مستقبل کا خواب دکھا کر دیکھتے دیکھتے مجھے ہوشیار کر دیا اور

میری زندگی کو سرتاسر دوزخ بنا دیا۔

میں روز شام کو بنارسی باغ کی سیر کو جایا کرتا تھا، ایک دن حسب معمول گھومتا پھرتا اس مقام پر پہنچا جو رنگ برنگ کی چڑیوں کے لئے وقف ہے اور بھی بہت سے لوگ وہاں جمع تھے، میں ایک سُرخ ساٹن کے رنگ کے طوطے کو بڑی محویت کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور خیال کر رہا تھا کہ اگلے زمانہ کے قصوں میں جس ہیرامن طوطے کی اتنی شہرت ہے وہ یہی طوطا رہا ہوگا۔ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیال میرے دل میں کیوں پیدا ہوا؟ چند منٹ اس عالم میں گزرے ہونگے کہ میری نظر ایک نوجوان لڑکی پر پڑی جو مجھ سے تھوڑے فاصلہ پر کھڑی اُسی خوشرنگ وخوش ادا پرندے کو دیکھ رہی تھی اور اپنی نگاہوں سے اسکی رعنائیوں اور دل رُبائیوں کی داد دے رہی تھی حُسن کی داد حُسن ہی دے سکتا ہے۔ میں اب طوطے کو چھوڑ کر اس پیکر رنگین میں محو ہوگیا جس کا اپنی ہمجنسوں میں قطعاً وہی مرتبہ تھا جو اس طوطے کا اتنے پرندوں میں تھا، آپ لوگ پوچھتے ہیں کہ وہ کیسی تھی؟ میں کیا بتاؤں کیسی تھی۔ سراپا کھینچنے کی قابلیت مجھ میں نہیں اور نہ ایسوں کا سراپا کھینچ سکتا ہے اس کو دیکھنے کے بعد میں نے سمجھا کہ خسرو کا تخیل مجبور کیسے ہوگیا اور آخر میں انھوں نے یہ کہہ کر کیوں ختم کر دیا۔ "وز ہر چہ گویم برتری جفا عجائب دلبری" "بس بہار بستر د نوروز آغوش" سنبھلے۔ شاعروں نے معشوقوں کے

رنگ روپ اور سج دھج کی جتنی تعریفیں کی ہیں یقین مانیے کہ وہ ان سب سے
بالاتر تھی، میری مبہوت نگاہوں نے شاید غیر شعوری طور پر اسکی رگوں میں
کچھ گدگدی پیدا کی۔ اس نے بھی مجھے دیکھا اور میری صورت اور انداز میں
نہ جانے کیا پایا کہ شرما کر آنکھیں جھکا لیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ اسوقت
وہ کیا معلوم ہوتی تھی۔ جسوقت میں بنارسی باغ سے لوٹا ہوں تو میری
زبان پر یہ مصرعہ تھا:۔

"آج اس طرح کا دیکھا ہے پریزاد کہ بس"

اس دن سے میں اپنے دل میں ایک نئی خلش محسوس کرنے لگا اور
یہ وہی خلش معلوم ہوتی تھی جس کو شاعروں نے محبت بتایا تھا، اس میں
ایک تازگی، ایک ندرت، ایک کیفیت، ایک ٹھنڈی جلن تھی، میں روز
بنارسی باغ جاتا تھا اور روز یہ اندر سبھا کی پری مجھے ملتی تھی، مجھے بہت
جلد معلوم ہو گیا کہ یہ دراصل کسی چھتری کی لڑکی تھی۔ مگر بچپن سے لاوارث
تھی، کوئی اس کو اپنی پناہ میں لینے والا نہ تھا۔ مسیحیت کے مبلغ آپ
جانتے ہیں ایسے وقت میں کس مستعدی اور تپاک سے آگے بڑھتے ہیں
اور کام آنے پر تیار ہو جاتے ہیں، یہ بیکس لڑکی بھی اُن کے حلقہ میں آ گئی
اور اب اُس کی زندگی خوشگوار اور پُرسکون تھی، جسوقت میں نے اُسکو دیکھا
تھا وہ لڑکیوں کے کالج میں ایف۔ اے میں پڑھتی تھی اس نے اپنا

ہندوانہ نام قائم رکھا تھا اور مس نمروترا کہلاتی تھی۔ جو لوگ اس سے بے تکلف تھے وہ اس کو کرشن کماری کہہ کر پکارتے تھے، یہ اسکا اصلی نام تھا عام طور پر وہ مغرور سمجھی جاتی تھی اسلئے کہ وہ کسی سے ملتی جلتی نہ تھی۔

میرے دل کی خلش کچھ اس طرح بڑھی کہ ایک درد بن کر مجھ پر چھا گئی میں روز اسی طرح بنارسی باغ جاتا تھا اور چپ چاپ اس "نور کی پتلی" کو دیکھ کر چلا آتا تھا۔ کئی بار چاہا کہ اس سے کچھ باتیں کروں اور اُس کو باتوں باتوں میں اپنی "ارنی" بھی سنا دوں، مگر میری گویائی نے ساتھ نہیں دیا اور میں گونگوں کی طرح اس کو پوجتا رہا، دو مہینے یونہی گزر گئے۔ میں برابر بنارسی باغ جاتا رہا، وہ البتہ کئی بار ناغہ کر چکی تھی، اب تک صرف دو ایک بار اُس نے جانوروں کے متعلق کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں مجھ سے کی تھیں اور بس۔

ایک دن اُس نے ہنس کر مجھ سے کہا۔ "آپ مجھ سے زیادہ اپنے معمول کے پابند معلوم ہوتے ہیں۔ کسی دن آپ نے بھی اپنی سیر ناغہ کی ہے؟" اسوقت ایک ایک کر کے بھیڑ چھٹ چکی تھی سوا میرے اور اُسکے اور کوئی نہ تھا۔ مگر اُس دن بھی میری زبان بند رہ گئی۔ میں اس سے زیادہ جواب نہ دے سکا کہ "جس دن سے آپ کہہ رہی ہیں اُس دن سے آجتک تو شاید کسی دن ناغہ نہیں ہوا ہے۔ اس سے پہلے یاد نہیں"۔

میں سمجھا کہ کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن شاید میری صورت اور لہجہ نے بہت کچھ کہہ دیا تھا، اُس نے مُسکرا کر مجھے دیکھا اور اس کے چہرے پر حیا اور معصومیت کا گہرا رنگ دوڑ گیا۔

دوسرے دن میں مصمم ارادہ کر کے چلا کہ اپنی تمنا کا اظہار ضرور کرونگا اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ میں پہنچا۔ کرشن کماری وہاں پہلے سے موجود تھی اُسنے جس انداز سے مجھے سلام کیا وہ میرزا مظہر جان جاناں کے اس شعر کی یاد دلاتا تھا۔

"سرازیں تیغ بُردن آسان نیست
آہ مظہر خسم سلام کسے"

اس ادا سے اس نے کبھی مجھے سلام نہیں کیا تھا، دیر تک ہم ادھر ادھر کی سیر کرتے رہے۔ جب لوگ اپنے اپنے گھر جانے لگے اور وہ بھی رخصت ہونے لگی تو میں نے ذرا ہمت کر کے کہا،۔

"ہم اتنے دنوں سے ایک دوسرے کو اتنا قریب ہو کر دیکھ رہے ہیں اور ہمارے درمیان اب تک شناسائی نہیں ہوئی۔ مجھے تو خیر معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کون ہیں اور کیا کرتی ہیں، مگر کیا آپ یہ جاننا نہیں چاہتیں کہ میں کیا ہوں اور کس قسم کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو تھوڑی دیر اور یہاں رُک جائیے، میں کئی دن سے آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا، جس کا

کہہ دینا کم از کم میرے لئے ضروری ہے مگر اب تک نہ مجھے اسکا موقع ملا اور نہ میری ہمت پڑی کہ کہوں"۔

وہ ہچکچائی اور رک کر کہا۔ "نہیں کوئی حرج نہیں، میں رک سکتی ہوں میں نے بھی کئی بار ارادہ کیا کہ آپ سے پورا تعارف حاصل کروں مگر کل سے پہلے اس کو بے محل اور خلاف آداب سمجھتی تھی۔ آج گھر سے سوچ کر چلی تھی کہ پوچھوں گی آپ کون ہیں اور لکھنؤ میں کیا کرتے ہیں؟ مگر خدا جانے کیوں بھول گئی"۔

اس کے بعد چہرہ کی سرخی پھر بڑھ چلی تھی اس نے مجھے اسپر غور کرنے کا موقع نہیں دیا اور کہنے لگی :۔

"مگر اب بتائیے کہ آپ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں اور اسی سلسلہ میں وہ بھی کہہ ڈالئے جو آپ اتنے دنوں سے کہنا چاہتے ہیں"۔

اس نے پھر نظر نیچی کر لی، وہ بری طرح شرمائی جا رہی تھی۔ شاید اُسنے میرے لب و لہجہ سے پتہ لگا لیا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے۔

میں نے اپنا نام بتایا اور کہا۔ "میں ایک انگریزی اخبار کا معاون مدیر ہوں، شروع سے لکھنے پڑھنے کا شوق رہا، اکثر انگریزی اور اُردو اخبار و رسائل میں مضامین لکھا کرتا ہوں اُردو میں شعر بھی کہا کرتا ہوں۔

.... "میں خواہ مخواہ اپنے تعارف میں اتنی طوالت سے

کام لے رہا تھا۔ کیونکہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اصل مطلب پر کیسے آؤں۔

اس نے اسی طرح نظر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "تو میں آپ کا نام سُن چکی ہوں، اس اخبار کا ایڈیٹر لکھنؤ میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور یوں بھی آپ بات چیت، حرکات و سکنات سے ادیب و شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی گفتگو میں ایک انداز ہوتا ہے مگر خیر! آپ اپنی بات کہیے"۔

میں نے اُس کو بغور دیکھا اور پھر کہا۔ "میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے متعلق آپ کو کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے۔ اگر آپ وعدہ فرمائیں کہ جو کچھ میں کہوں اُس کو غور سے سنیں گی اور اگر ناگوارِ خاطر ہوا تو مجھ کو معاف کر دینگی تو کہنے کی جراءت کروں"۔

"ہاں میں نے وعدہ کیا۔ کہیئے اور جلد کہیئے"۔ اُس نے جواب دیا۔

"آپ اپنے خدا کو مان کر مجھے اوباش نہ سمجھئے گا، آج اگر آپ نے وہ جذبہ میرے اندر نہ پیدا کر دیا ہوتا جس نے مجھے اس طرح مجبور و بے بس کر رکھا ہے تو شاید نوبت نہ آتی، مگر اب تو یہ نوبت آگئی"

اتنا کہہ کر میں رُک گیا اور پھر یہ مصرعہ پڑھا:۔

"اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را"

اس نے کہا۔ "اس کا مطلب سمجھائیے"۔

میں نے مطلب سمجھایا، اُس نے اپنا مُسکراتا ہوا معصوم چہرہ اوپر

اٹھایا اور مجھے دیکھنے لگی، انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میری زبان سے محبت کا اقرار سُن کر کچھ زیادہ حیرت نہ تھی۔ میں نے پھر کہا:۔

"اگر میں نے گستاخی کی ہے اور اگر آپ اس سے بدمزہ ہوئی ہیں تو خدا کے لئے معاف کر دیجئے۔ میں پھر کچھ نہ کہوں گا، میں آپ سے بھاگتا رہوں گا اور اپنی صورت آپ کو کبھی نہ دکھاؤں گا، لیکن اتنا یقین رکھیے کہ آپ نے مجھے بے قابو کر دیا، ورنہ میں اپنا راز اس طرح افشا کر کے اپنے کو رسوا نہ کرتا، آپ کو دیکھنے کے بعد میری جو حالت ہو گئی ہے وہ میرے لئے ایک نیا تجربہ ہے آج مجھے معلوم ہوا کہ کیٹس کا کہنا غلط نہیں۔ "حسین چیز ایک ابدی مسرت ہے"۔ اب میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "اگر دل کو راحت پہنچاتا ہے تو کسی حسین چیز سے لگائیے"۔ یہ آپ نے مجھے بتایا، مجھے یہ کہنے میں مطلق عار نہیں کہ سوتے جاگتے آپ مجھ پر چھائی رہتی ہیں، آپ ہی کا خواب دیکھا کرتا ہوں، آپ ہی کے تصور میں کھویا رہتا ہوں، اب آپ کو جو کچھ کہنا ہو کہہ دیجئے لیکن اگر آپ نے مجھے لکھنؤ کے تماش بینوں میں شمار کیا تو اس سے بڑھ کر ظلم اور حق تلفی نہیں ہو سکتی"۔

اُس نے کہا "آپ اطمینان رکھیے۔ میں آپ کو وہی سمجھتی ہوں جو اب سے پہلے سمجھ چکی ہوں، مگر آپ کی باتوں کا جواب اسوقت نہیں دے سکتی

آپ مجھے اپنا پتہ دیدیجئے۔ میں آپ سے خود آکر ملوں گی اسوقت مفصل گفتگو کروں گی"۔

میں نے اپنا پتہ بتایا۔ اس نے کہا "اتوار کی صبح کو آپ میرا انتظار کیجئیے گا"۔

میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ دفعتاً کسی نے مجھے فردوس بریں میں پہنچا دیا ہے۔ چند لمحوں نے میری دنیا کو کچھ سے کچھ کر دیا تھا۔ کرشن کماری نے چند مبہم اور غیر واضح جملے کہہ کر میرے اندر ایک روح پھونک دی تھی۔ میں اب زندگی میں ایک نیا مزا، ایک نیا نشاط محسوس کرنے لگا تھا۔

اتوار کے دن کے لئے میں گھڑیاں گننے لگا تھا، میں بیچین تھا مگر یہ امیدوں کی بیچینی تھی اور اس میں ایک لذت تھی۔ خدا خدا کر کے اتوار کی صبح آئی اور اپنے ساتھ نوید مسرت لائی۔ کرشن کماری نے آتے ہی کہا "کہئے اب آپ کو کیا کہنا ہے"۔

میں نے جواب دیا "مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ برے بھلے کہہ چکا اب اس وقت تک میں پھر اپنے میں کچھ کہنے کی تاب نہیں پاتا جبتک کہ آپ کچھ نہ کہہ لیں"۔

کرشن کماری مسکرائی، اسوقت اسکی مسکراہٹ معنی خیز تھی اور کہنے لگی "میں خود آپ کو روز روز دیکھتے دیکھتے آپ میں ایک کشش محسوس کرنے

لگی ہوں۔ مگر یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ میں آپ پر اسی طرح فریفتہ ہوں
جس طرح آپ مجھ پر ہیں۔ آپ لوگ اتنا جلد چھلک کیوں پڑتے ہیں؟
محبت کے اظہار میں اس قدر عجلت نہیں کرنا چاہیئے، آپ نے کبھی اس پر
غور کیا ہے کہ محبت کیا چیز ہے؟ اسکی غایت کیا ہے؟ اور اس کے
مطالبات کیا ہیں؟ اور اگر غور کیا ہے تو کیا آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں
کہ آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے؟"

اس سیدھی سادی بھولی بھالی لڑکی سے ایسے سوچے سمجھے سوالات
کی میرے فرشتوں کو بھی امید نہ تھی۔ میں دنگ رہ گیا۔ لیکن پھر میں نے
سمجھا کہ یہ اعلیٰ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ میں نے بے تامّل جواب دیا:۔
"یقین مانیئے میں عمر بھر انھیں سوالات پر غور کرتا رہا ہوں میرا ایمان
یہ ہے کہ اگر محبت نہ ہو تو زندگی ایک آزار ہے۔ جب سے آپ کو دیکھا ہے
اپنی حالت پر دن رات غور کرتا رہا ہوں اور میں اعتماد اور صداقت کے
ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے ایسی محبت کہ اگر
آپ نے میری محبت کی پذیرائی نہیں کی تو میں خراب و برباد ہو جاؤں گا۔"
"اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عمر بھر آپکی یہی حالت رہے گی؟" اُسنے سوال کیا۔
میں نے کہا۔ "اگر میرے بس میں ہوتا تو دل چیر کر دکھا دیتا۔ کیوں
کیا میری باتوں کا اعتبار نہیں آتا؟"

"نہیں یہ بات نہیں"۔ اُس نے جلدی سے کہا۔" مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ آپ نے اپنے دل کو کہاں تک ٹٹولا ہے اور اپنی حالت کا کس حد تک صحیح اندازہ کیا ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو آئندہ کیلئے اس بلند آہنگی اور اعتماد کے ساتھ کوئی دعویٰ نہ کرتی، زمانہ نہ جانے کیسی کیسی کروٹیں لیتا ہے زندگی میں نہ جانے کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، انسان زمانہ اور فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے"۔

"ہاں مگر محبت مجبور نہیں ہے، وہ زمانہ اور فطرت دونوں کی گرفت سے آزاد ہے"۔ میں نے جوش میں آکر کہا۔

ممکن ہے آپ ہی سچ کہتے ہوں"۔ اُس نے جواب دیا۔" خیر آپ کہتے ہیں اور میں مانے لیتی ہوں کہ آپ مجھے چاہتے ہیں اور آپ کے دل و زبان میں کوئی ناموافقت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ میں آپ کی محبت کو نہ قبول کروں لیکن اسوقت اپنے اندر کوئی جذبہ نہیں پاتی جس سے میں مغلوب ہوں، ہاں آپ کے ساتھ ایک دلچسپی ضرور پیدا ہو گئی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر میں آپ کو اسی دھن اور سرگرمی کے ساتھ چاہنے لگوں۔ بشرطیکہ آپ کا دعویٰ صحیح ہوا اور مجھے آپ یونہی چاہتے رہے، مجھے اب تک کسی مرد سے لگاؤ نہیں ہوا ہے آپ پہلے شخص ہیں جس نے میرے دل میں جگہ پائی ہے"۔

میں یہ سُن کر اُچھل پڑا اور اُسکے دونوں ہاتھوں کو ہاتھ میں لے کر پوچھا "سچ ؟ تو یہ میری محبت کی صداقت کا اثر ہے"۔

اُس نے اپنے ہاتھ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ سے ہٹا لئے اور کہا۔ "آپ نے میرے دل میں اتنی جگہ لے لی ہے کہ دن میں دو ایک بار آپ کا خیال ضرور آجاتا ہے۔ مگر دیکھئے یہ محبت کے دن رہتی ہے"۔

میں نے پوچھا۔ "آخر اس بدگمانی کی وجہ ؟ کیا اس سے پہلے بھی محبت کا کوئی تجربہ ہو چکا ہے" ؟

اس نے کسی قدر بُرا مان کر کہا۔ "میں نے ابھی آپ سے کہا ہے کہ آپ پہلے شخص ہیں جس سے مجھ کو اتنا بھی تعلق پیدا ہوا ہے"۔ میں شرمندہ ہو گیا۔

وہ اُٹھ کر جانے لگی تو میں نے کہا۔ "کیا میں یہ التجا کر سکتا ہوں کہ آپ مجھ سے ملتی رہیں، اس سے مجھے بڑی راحت ملے گی اور میں آپ کو دعائیں دوں گا"۔

اس نے کہا۔ "ہاں ! میں اپنی فرصت کا زیادہ حصہ آپ کے پاس گزاروں گی، مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے"۔

اب میری زندگی میں کمی کیا تھی ؟ میں کرشن کماری کو اپنی چیز سمجھنے لگا تھا، مذہبی اور معاشرتی اختلاف میرے لئے کوئی اختلاف نہ تھا

مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ میری بیوی ہو گی اور میری اپنی مختصر دنیا سارے فتنہ و فساد سے الگ جنت کا ایک نمونہ ہو گی۔ کرشن کماری روز مجھ سے مل کر پیاری پیاری باتیں کر جاتی تھی اور میری محبت دن دونی رات چوگنی ہو رہی تھی۔

بیگانہ دم لینے کے لئے پھر رک گیا اور ایک پیالی چائے اور پی کر کہنے لگا۔ "چھ مہینے گزر گئے، یہ میری زندگی کی بہترین ساعتیں تھیں، آہ! کیسا خوبصورت خواب تھا، کتنا دلکش طلسم تھا، صبح و شام دونوں وقت کرشن کماری مجھ سے ملنے آتی تھی۔ اُس کی ایک ایک ادا، اُسکی ایک ایک حرکت گواہ تھی کہ وہ بھی مجھے بُری طرح چاہنے لگی ہے۔ اب اُسکو مجھ سے کوئی تکلف یا حجاب باقی رہ گیا تھا، نہ مجھ کو اس سے، اور بظاہر دونوں کی وہی حالت تھی جو دو سرشاران محبت کی ہونا چاہیے، لیکن جب کبھی میں اُسکی زبان سے محبت کا اقرار لینا چاہتا تو وہ کچھ مضمحل سی ہو جاتی اور کہتی بس جس طرح گزر رہی ہے گزرنے دو۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ تم سے میرے دل کو گہرا تعلق ہو گیا ہے؟ کیا تم کو اس سے اطمینان نہیں ہے؟ آخر قیامت تک کے وعدے لیکر کیا کرو گے؟"

بعض اوقات وہ ایک عجیب عورت معلوم ہوتی تھی جسکے دل کا بھید پانا مشکل تھا، کبھی کبھی مجھے الجھن سی ہونے لگتی تھی مگر میں اُسکی محبت

میں اندھا تھا اور کرشن کماری کی اس قسم کی پُراسرار باتوں کو بھی اس کا ایک شیوۂ دلبری سمجھ کر رہ جاتا تھا۔ میں اب کرشن کماری سے شادی کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا اور وہ مجھے تڑپا رہی تھی، میں جب کبھی یہ ذکر چھیڑتا تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی،

"آخر میں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی ہوں، اگر چاہو گے تو یہ بھی ہو جائے گا۔ آخر جلدی کا ہے کی ہے"؟

آخر انتظار کرتے کرتے میں عاجز آ گیا تو ایک دن اُس سے کہا۔

کرشن کماری! آخر کب تک ٹالتی رہو گی؟ میں آج یہ جاننے پر تلا ہوا ہوں کہ تم زندگی بھر کے لئے میری رفیق بنو گی یا نہیں؟ میں اب کوئی عذر نہیں سنوں گا۔ تم کو جواب دینا ہو گا لیکن یہ یاد رہے کہ اگر تم نے میرا دل توڑا اور انکار کیا تو پھر میرا خدا حافظ ہے"۔

کرشن کماری ابھی بلبل کی طرح چہک رہی تھی، یہ سُن کر افسردہ ہو گئی اور اسکے بعد پھر میں نے اس کو دل سے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، اسنے غیر معمولی سنجیدگی اختیار کر لی اور جواب دیا:۔

"نہ کل تم دفتر جاؤ، نہ میں کالج جاؤں۔ دن بھر میں یہاں تمہارے ساتھ رہوں گی اور کل ہی کسی وقت تمہارے سوال کا جواب بھی دونگی"۔

کیا مجھے انکار کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے۔ میں نے بات

کاٹ کر پوچھا:۔

"نہیں! اگر تم کو انکار نہیں تو مجھ کو بھی انکار نہیں۔ آخری فیصلہ تم پر منحصر ہے"۔ اس نے تھمتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"تو پھر میرا فیصلہ تم جانتی ہو۔ میں سمجھوں کہ بات طے ہو گئی؟" میں نے جامہ سے باہر ہو کر کہا۔

"ہاں ..... مگر کل تک اور ٹھہرو"۔ اس نے رُک رُک کر کہا۔

کرشن کماری چلی گئی تو میں سوچ میں پڑ گیا، رات کو دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، اس مسلسل حیلہ جوئی کے کیا معنی؟ یہ گول گول باتیں کس لئے؟ کیا وہ مجھ کو چاہتی نہیں۔ نہیں! محبت تو اُس کی ہر ہر نگاہ سے ٹپک رہی تھی۔ پھر؟ کیا اسکی زندگی میں راز ہے؟ میں بالکل تاریکی میں تھا۔ سوچتے سوچتے سر دُکھنے لگا آخر کار یہ کہہ کر سو رہا۔ "کل تو فیصلہ ہو ہی جائے گا۔ یہ خواہ مخواہ کی بے چینی کیوں ہے؟"

جس "کل" کا وعدہ تھا وہ بھی آیا۔ آہ! کاش وہ "کل" میری زندگی میں کبھی نہ آتا۔ کرشن کماری کے آنے سے پہلے میں حضرت گنج گیا اور اس کے لئے ایک پچھتر روپے کی انگوٹھی خرید لایا۔ یہ خیال میرے دل میں ایک ولولہ پیدا کر رہا تھا کہ کرشن کماری اس تحفہ سے کتنا

خوش ہوگی، اگرچہ اس کے ساتھ کفایت شعاری پر ایک لکچر بھی دے گی۔ وہ کئی بار مجھے بیجا صرف پر جھڑکیاں دے چکی تھی۔

کرشن کماری آئی، دن بھر رازونیاز ہوتے رہے، آج وہ کسی سوچ میں تھی۔ اُس کا چہرہ دُھندلا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری رات جاگتی رہی ہے۔ کبھی میرے پیار پر اگر میری خاطر سے مسکراتی بھی تھی تو اسکی مسکراہٹ میں تکلف نمایاں ہوتا تھا، کوئی بارہ بجے کے قریب اسنے مجھ سے پوچھا:۔

"کیوں تم مجھے حسین سمجھتے ہو اور حسین چیز ایک ابدی مسرت ہے"؟

میں نے کہا "بیشک"۔

"فرض کرو کہ میں ابھی لولی، لنگڑی، اندھی یا کوڑھن ہو جاؤں، کیا تب بھی تم مجھے چاہتے رہو گے"؟

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "ہاں! مگر تم یہ ہذیانات کیوں بک رہی ہو"؟

"اچھا تو آج میں تم کو اپنے حُسن کا بہترین سماں دکھاتی ہوں جس کے اب تم مستحق ہو گئے"

یہ کہہ کر اُس نے سینے کے بند کھول دئے اور گردن سے ناف تک ننگی ہو گئی۔ میں اپنی حالت کس زبان سے بیان کروں، اس لمحہ اور

اس منظر کا خواب میں بھی گمان نہ ہو سکتا تھا اُف! یہ میں کیا دیکھ رہا تھا؟
کیا میری آنکھیں دھوکا دے رہی تھی؟ میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔
اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، مجھے بجلی مار گئی تھی، میری زبان سے ایک
حرف نہ نکل سکا۔ مجھے سکتہ میں دیکھ کر وہ مُسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ
میں نشتر تھے۔ اس نے کہا:۔

"اب جلد فیصلہ کرو، میرے ساتھ شادی کب کرو گے"؟

میرا خون برف کی طرح جم گیا تھا، میرے منھ سے آواز تک
نہیں نکلی، میری یہ حالت دیکھ کر اس نے کہا:۔

"میں تم سے کہتی تھی کہ آئندہ کے متعلق کوئی دعویٰ نہ کرو۔ مگر تم تو
میری صورت دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھے، پھر میں نے چاہا کہ ایک
دوسرے کے ساتھ یوں ہی خوش باشی کی زندگی بسر کر ڈالیں مگر تم نے
یہاں بھی دم نہ لینے دیا۔ مجھے خود بھی تم سے دل بستگی پیدا ہو گئی تھی لیکن
میں تمہاری محبت کی حقیقت جانتی تھی، اب تک تم کو اس راز سے
کیوں آگاہ نہیں کیا؟ اس لئے کہ میں چاہتی تھی ذرا تمہاری محبت مستحکم اور
راسخ ہو لے تو اس کو آزماؤں اور تمھیں بتاؤں کہ میرے حُسن کی کائنات
کیا ہے اور تمھاری محبت کی دراصل کیا حقیقت ہے۔ یہ داغ میرا موروثی
ترکہ ہے۔ ہر پشت میں کوئی نہ کوئی اس میں مبتلا رہتا ہے، باپ دادا کے

گناہوں کا پھل اب مجھے ملا۔ میں جانتی تھی کہ میں کسی کی محبت کے قابل نہیں ہوں مگر تم نے مجھے چاہا اور مجھے بھی بہکایا۔ اب تم سمجھے کہ میں تمہارا منھ کیوں نہیں چومتی تھی اور اپنا منھ تم کو کیوں نہیں چومنے دیتی تھی میں سُن چکی تھی کہ یہ مرض ہونٹوں کی چھوت سے بھی اکثر پیدا ہو جاتا ہے ---------- مگر اب تو تم یہ بتاؤ کہ مجھے زندگی بھر کیلئے اپنی رفیق کب بناؤ گے؟"

میں اسی طرح پتھر کی مورت بنا رہا، آخر کار وہ یہ کہتی ہوئی جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی :-

"اچھا تو خدا حافظ! میرا تمہارا ساتھ یہیں تک تھا، حسین چیز کی حقیقت اب تمہیں معلوم ہو گئی ہو گی۔ محبت کا راز اب کھل گیا ہو گا؟ اگر اُس وقت میں کہتی کہ محبت ایک دھوکا ہے تو تم کب ماننے والے تھے اور اب؟"

یہ کہتی ہوئی وہ زینہ سے اُتر گئی۔ میں نے اُس کو روکا بھی نہیں، جو انگوٹھی میں اس کے لئے لایا تھا اُس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی مگر ابھی اس کو پہنا نہیں تھا۔ وہ اسی طرح مخمل کے ڈبہ میں سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی - میرے منھ سے یہ بھی نہ نکلا کہ کم از کم اس یادگار کو لیتی جاؤ۔

اس دھکّے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ چار دن تک بستر سے ہلا نہیں احباب عیادت کو آتے تھے اور اُن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی بظاہر مجھے کوئی بیماری نہیں تھی لیکن میرا دل بیمار تھا، رگ رگ میں نشتر چُبھ رہے تھے۔ پانچویں دن میں اُٹھا اور اپنی ملکہ سبا کی تلاش میں چلا۔ بنارسی باغ میں اُس کا پتہ نہ تھا، قیام گاہ پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ ابھی کل وہ کسی پہاڑی مقام پر چلی گئی ہے کیونکہ عرصہ سے اسکی صحت خراب ہو رہی تھی اور ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ پہاڑ کی آب وہوا اسکے لئے ضروری ہے"۔

اب میری دنیا میں ہر طرف اندھیر اگھپ تھا اور مجھے کچھ نہیں سوجھتا تھا، اس کے بعد لکھنؤ میں رہنا میرے لئے دشوار ہو گیا، ایک ایک چیز سے اس کی یاد آرہی تھی۔ اس کے آخری الفاظ میرے دل میں چٹکیاں لے رہے تھے جس محبت کو میں "فلاح دارین" سمجھے ہوئے تھا وہ ایسی جھوٹی نکلی! میرا دل مجھے ملامت کر رہا تھا مگر میری جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ ایسی حالت میں کیا کرتا؟ اس کی بے بسی بھی ایسی ہی ہوتی۔

میں نے لکھنؤ چھوڑ دیا، میرے حواس مختل ہو گئے۔ کسی کام میں میرا جی نہیں لگتا تھا۔ اس تاریخ سے آج تک یونہی اسی ہیئت سے دن

گزر رہے ہیں۔ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے کرشن کماری رہتی ہے۔ مجھے نہ کھانے پینے کا ہوش رہتا ہے نہ گرد و پیش کی باتوں کا نہ کوئی مستقل صورت معاش ہے اور نہ اسکی فکر میں جینے ہی سے بیزار ہوں۔

آہ! میں نے اُس کو اپنی بیوی کیوں نہیں بنایا؟ مجھے اس وقت کیا ہو گیا تھا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس روز مجھے کیا ہو گیا تھا۔

لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے ہیں۔ میں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھتا اول اول عزیزوں اور دوستوں نے چاہا کہ میں شادی کر لوں اور اپنی حالت کو سدھاروں، مگر میں کیا کروں۔ مجھے دنیا کی ہر عورت کوڑھی نظر آتی ہے۔

برسوں سے اسی طرح مارا مارا پھرتا ہوں۔ اگر زیادہ عرصہ تک کہیں ٹک جاؤں تو سارے بدن میں ایک طرح کا درد پیدا ہو جاتا ہے چار برس تک میں نے کرشن کماری کو نہیں دیکھا اور نہ یہ پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے؟ لیکن گزشتہ سال میں لکھنؤ آیا تھا تو معلوم ہوا کہ وہ راہبہ ہو گئی اور یہیں رہتی ہے۔ میں نہ جانے کیوں اُس سے ملنے گیا مگر اُس نے ملنے سے انکار کر دیا۔

کیا آپ لوگ یقین کریں گے اگر میں کہوں کہ میرے دل میں ایک داغ پڑ گیا ہے جو ہر وقت جلتا رہتا ہے اور مجھے بے چین کئے رہتا

یہ اُس داغ کا جواب ہے جو کرشن کماری کے سینہ پر ہے
میں اپنے کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں اُس دن گونگا کیوں
ہو گیا تھا، میں نے کیوں نہیں اسی جوش اور اُمنگ کے ساتھ کہا:۔
"ہاں کرشن کماری! میں اب بھی تم کو چاہتا ہوں اور اسی گھڑی
تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں"۔
لیکن میرے مقدر میں تو یوں خاک چھانتے پھرنا تھا، اب آپ
ہی لوگ بتائیے کہ میں محبت کو کیا سمجھوں؟ آہ! زندگی کیسی ظالم
نکلی؟ آخر قدرت کی بیدردیوں کی کچھ انتہا بھی ہے؟"
رات کے تین بج گئے تھے، بیگانہ نے اپنی عبرت انگیز کہانی
ختم کردی، تھوڑی دیر کے بعد اس نے خود بخود ہم لوگوں کی طرف سے
خالی الذہن ہو کر گنگنا کر یہ شعر پڑھا:۔

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

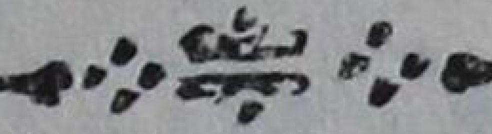
یہ آخری الفاظ تھے جو اُس کی زبان سے ہم لوگوں کے سُننے
میں آئے۔

چار بجے کے قریب ہم لوگوں کو پھر نیند آگئی، دن چڑھے آنکھ
کھلی تو ہمارا مہمان جا چکا تھا، اس کے بعد سے آج تک پھر کبھی ملاقات

نہیں ہوئی، نہ جانے کس حال میں ہے اور کہاں ہے؟ دنیا میں ہے بھی یا نہیں؟

اُس کی داستان محرومی سُن کر اتنا اثر ہم لوگوں پر ضرور ہوا کہ اب کبھی محبت یا زندگی کے مسئلہ پر کچھ کہنے کے لئے دل نہیں اُبھرتا۔

سنہ ۱۹۳۱ء



شکستِ صدا

(۱)

ایک دل جلے مصنف کا قول ہے کہ اب تک دنیا میں نہ جانے کتنے بے بنیاد افسانے سنگین تاریخی واقعات بنا کر پیش کیے جا چکے ہیں اور نہ جانے کتنے واقعات ہیں جن کو محض افسانہ بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے، اور دنیا والے تنقید و تفحص کے عنصر سے کچھ اسقدر عاری ہوتے ہیں کہ اُن کو جو چیز جس صورت میں بھی ملی اُس کو بجنسہ قبول کر لیا بشرطیکہ صورت دلکش اور نظر فریب ہو۔ اسی خیال سے اب تک میں ناصری کی سرگزشت عوام کے سامنے پیش کرنے سے گریز کرتا رہا کیونکہ پڑھنے والے اس کو بھی زیادہ سے زیادہ میری پرواز تخیل کا ایک کرشمہ سمجھ لیں گے، اور اگر انتہائی دریا دلی سے کام لیا تو میری کاوش اور خامہ فرسائی کے صلہ میں یہ کہہ دیں گے کہ "خوب لکھا گیا ہے" لیکن انصاف کی رو سے یہ صلہ میرے لئے کوئی صلہ نہ ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ تو ناصری میرے دماغ کی پیداوار ہے اور نہ اسکی سرگزشت کوئی گڑھا ہوا افسانہ ہے وہ بھی اسی

گوشت پوست کا انسان ہے، جس سے ہم آپ سب بنے ہیں
وہ اسی کثیف دنیا میں سانس لیتا رہا ہے جس کو "دار المحن،
سجن المومنین" اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا ہے البتہ اپنی شخصیت کے
لحاظ سے وہ ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ اس لحاظ سے
اگر دیکھا جائے تو بہت کم ہستیاں ایسی نکلیں گی جو اسکی ہمسر
بن سکیں۔ ناصری کی یہی نمایاں حیثیت ہے جس نے عرصے
سے میرے دل میں یہ خیال پیدا کر رکھا ہے کہ اس کی ایک "سیرت"
تیار کی جائے جس کا وہ یقیناً حقدار ہے۔

میں بچپن سے ناصری کا غائبانہ طور پر گرویدہ تھا۔ جب سے مجھ میں
تھوڑا بہت علمی و ادبی شوق پیدا ہوا ناصری کی طرز تحریر نے میرے دل و
دماغ پر اپنا سکہ جما لیا تھا۔ مجھے بھی حوصلہ تھا کہ ناصری کی طرح سحر نگار
بن جاؤں۔ ہندوستان میں اُردو اور انگریزی کا شاید ہی کوئی رسالہ ہو
جسمیں اس کے مضامین نہ چھپتے ہوں اور میں ہر اُس رسالہ کو منگایا کرتا
تھا جس کے قلمی معاونین کی فہرست میں ناصری کا نام ہوتا۔ بعد کو مجھے
معلوم ہوا کہ ناصری صرف اہل قلم ہی نہیں ہے بلکہ مقرر بھی ہے۔ اسکی
تقریر میں بھی وہی جادو ہوتا تھا جو اس کی تحریر میں تھا۔

میں نے ناصری کے مضامین کا غائر مطالعہ کیا تھا جن سے بہت

کچھ اسکی شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا، میرے خیال میں بہ حیثیت صاحب قلم کے اس کی زندگی کے چار دور ہو سکتے ہیں، ایک تو ابتدائی دور جس میں اس نے صرف نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ غزلیں اسکی عموماً تڑپا دینے والی ہوتی تھیں۔ نظموں میں "تخلیق کائنات" اور "شاعر کی دنیا" اسکی شاعری کی بہترین یادگاریں ہیں جن کی کسی زمانے میں بڑی دھوم ہوگئی تھی ان کے علاوہ اور بھی کئی نظمیں ہیں جن کا تعلق جذبات سفلی سے ہے اور جو بُری طرح انسان کے اعصاب میں تلاطم برپا کر سکتے ہیں مگر تھوڑ ہر نظم کے نرالے ہیں جو ناصری کو دوسرے شعراء سے ہمیشہ ممتاز رکھیں گے دوسرا دور وہ ہے جس میں اس نے زیادہ تر افسانے لکھے اور اُردو افسانہ نویسی میں ایک نئی طرح ڈال کر اپنے کو فسانہ نویس تسلیم کرالیا۔ اسکو بحیثیت اُردو افسانہ نویس ایسی شہرت ملی کہ لوگ اس بات کو بھول گئے کہ اُس نے کبھی شاعری بھی کی ہے۔ یوں تو اس کا ہر افسانہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک اچھوتی چیز ہوتا تھا لیکن اس کے دو افسانے "حدیث آرزو" اور "پراگندہ دل" مجھ کو خصوصیت کے ساتھ یاد رہیں گے۔ "حدیث آرزو" میری نگاہوں میں اس لئے ممتاز ہے کہ وہ بہت کچھ میری اپنی زندگی کا نقشہ ہے، مجھے یاد ہے کہ اس کے ایک ایک ٹکڑے نے مجھ کو کس طرح بیچین کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر ایک ٹکڑا لیجئے۔ میرا خیال ہے کہ

اُردو ادبیات میں جدت خیال اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ایک
خاص مرتبہ رکھتا ہے۔

"آپ میری زندگی کی اس شق کو لیجیے جو عورت اور محبت سے تعلق
رکھتی ہے یا یوں سمجھیے کہ سب سے پہلے زندگی کا وہ رُخ پیش کرنا چاہتا ہوں
جو زرلینہ کو اور مجھ کو دوش بدوش رہنما کرتا ہے۔

فریب عشق بازی میدہم اہل تماشا را

اور اسی سلسلے میں دنیا کو علوم ہو جائے گا کہ میں بحیثیت مجموعی
کس قسم کا جانور ہوں، سچ پوچھیے تو عشق اور محبت رومانیت اور
شعریت کا کوئی خاص مفہوم میرے دماغ میں نہیں ہے۔ میری رائے
میں یہ سب مہمل الفاظ ہیں۔ کم از کم اس عاشقی کا تجربہ تو مجھے بالکل نہیں ہے
جس میں وصل اور ہجر کی عظیم الشان اصطلاحیں متعین کی جاتی ہیں اور ہم
اپنی ساری عمر تمنائے وصل اور شکوہ ہجر میں بسر کر دیتے ہیں صبر و سکون
کھو بیٹھتے ہیں دن رات کرب و اضطراب میں مبتلا رہتے ہیں، دنیا کا کوئی
کام نہیں کر سکتے اور آخر کار خدا جانے کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ ہاں
تو کہنا یہ تھا کہ زرلینہ کے ساتھ مجھے محبت نہیں تھی اگر محبت کا مفہوم
وہی ہے جو عوام نے سمجھ رکھا ہے اور نہ دفعتاً پہلی نگاہ میں مجھے اسکے
ساتھ وابستگی پیدا ہوئی جیسا کہ عموماً محبت کی ابتدا ہوا کرتی ہے، ایک

طویل مدت تک ہم دونوں کو ایک دوسرے کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق بن گئے۔ مجھے اس کے ساتھ موانست پیدا ہو گئی اور اس کو میرے ساتھ، اور یہ موانست زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ شغف و انہماک کی اس حد تک پہونچ گئی جہاں دو ہستیوں کے محسوسات ایک ہو جاتے ہیں، وہ تو خیر اس جنس سے تعلق رکھتی ہے جسے آپ لطیف نازک اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں مگر خود میں بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ برسوں اسکے ہنسنے پر ہنستا اور اسکے رونے پر روتا رہا۔ باوجود اسکے کہ میری جنس کرخت اور عورت کے مقابلہ میں بہت کم الحس قرار دی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ آپ میری زندگی کے اس باب پر تبصرہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں :۔

"کہ اندر کے یہ اداہائے عشق مانند است"

دوسرا افسانہ "پراگندہ دل" ہے۔ جس کا اثر مجھ پر ایک مدت تک رہا ہے۔ اس عجیب و غریب افسانے نے ناصری کی شخصیت کا اندازہ کرنے میں میری بڑی مدد کی۔ مجھے یقین ہے کہ "پراگندہ دل" صرف ایک نقاب ہے جس میں اس نے اپنی ہستی کو چھپانے کی کوشش کی ہے شروع سے آخر تک اسکا ایک ایک جملہ پڑھنے والے کے دل میں

ایک ہیجان پیدا کر سکتا ہے اور کوئی تعجب کی بات نہ ہو گی اگر اکثر کم ظرف اور خام کار نوجوان اس کو پڑھ کر گمراہ ہو جائیں۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔

میں کبھی اپنی رو میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہوں جس سے میرے حواس کی بے ربطی کا کافی پتہ چلتا ہو گا لیکن میرے دوستوں کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ میں کوئی داستان نہیں سنا رہا ہوں، میری زندگی میں کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ ہے بھی نہیں جس کو داستان بنا دوں، میں بس یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مجھ جیسے لوگوں کے لئے مرنے سے پیشتر دنیا میں کیا اجر جمیل ہوا کرتا ہے میں کسی کو دھوکا دینا نہیں چاہتا، کوئی یہ نہ سمجھے کہ نفسانیت کی زندگی سے ہمیشہ دور رہا ہوں، میں نے آسودگی کی تلاش میں ایک مدت تک اپنے نفس کی غلامی کی ہے۔ ایک عمر آلودگیوں میں گزار چکا ہوں۔ میں کوئی واعظ یا پند گو نہیں ہوں۔ آسکر وائلڈ کی طرح میں بھی گناہ کو ارتقائے انسانی کا لازمی عنصر سمجھتا ہوں، پارسائی کے لفظ سے مجھے چڑ ہے روحانیت مجھ کو ڈھکوسلا معلوم ہوتی ہے۔ خیر و شر کی حیثیت میرے نزدیک اضافی ہے یعنی ایک ہی فعل جو ایک موقع پر گناہ ہے کسی دوسرے موقع پر عین ثواب ہو گا۔ بہر حال ایک عرصے تک میں بھی اس قسم کی زندگی بسر کرتا رہا ہوں جو عام طور پر گمراہی اور ضلالت کی زندگی سمجھی جاتی ہے۔ میرا بھی مقصد صرف سکون حاصل کرنا تھا، معلوم نہیں اور لوگ کبھی اپنے اس مقصد

میں کامیاب ہوئے یا نہیں، لیکن میں تو بُری طرح مایوس ہوا، سکون ملنا تو ایک طرف میری سرمستیوں اور ہوس ناکیوں نے میری غیر واضح بے چینی اور اضطراب میں اضافہ کردیا۔ سنا کرتا تھا کہ شراب ایک کیف خود فراموشی پیدا کردیتی ہے اور اسکے پینے والے اپنی ناکامیوں کے دردناک احساس کو بھول جاتے ہیں مگر قسمت کی اس ستم ظریفی کو کیا کہوں کہ جب اسی غرض سے میں نے شراب پی تو خودی کا احساس مجھ میں اور تیز ہوگیا۔ بھولی ہوئی ناکامیاں یاد آگئیں اور اس طرح میری بیتابیاں بڑھتی گئیں، گویا نشہ کی حالت میں مجھ پر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جسے آپ لوگ "خمار" کہیں گے آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ کوئی مجذوب کی بڑ نہیں کسی کی واقعی زندگی ہے۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"ولس (WELLS) کا قول ہے کہ ناآسودگی زندگی کی روح رواں ہے۔ برنرڈ شا آسودگی کو موت سمجھتے ہیں "بیدل" بھی "عالم آسودگی کی ہوا" کو "جنون خیز" بتاتے ہیں۔ میرا تجربہ بھی یہی ہے کہ انسان کا زندگی میں سکون کی تمنا کرنا ایک فعل عبث ہے ممکن ہے سکتہ یا سبات کے مریضوں کو کبھی آسودگی نصیب ہو جاتی ہو مگر ان کے سوا کوئی صحیح اور توانا آدمی ایسا خوش نصیب نہیں ہو سکتا۔

مطلبے گر بود از ہستی ہمیں آزار بود ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود

اس سے یہ مراد نہیں کہ آپ اپنا رونا بھی نہ روئیے"۔

ناصری کی ادبی زندگی کا تیسرا دور وہ ہے جس میں اس نے زیادہ تر فلسفیانہ اور تنقیدی مضامین لکھے اس میں بھی اس نے اپنی طرز تحریر اور انداز تنقید کو ممتاز رکھا۔ "شوپنہار اور اسکا فلسفہ"۔ تصوف اور افلاطون کا نظریہ تصورات" "شرح ویدانت" اور "عرفان حیات" اس دور میں اسکی بہترین یادگاریں ہیں۔

چوتھا دور سیاسیات واقتصادیات کا ہے جسمیں ناصری نے عموماً انگریزی زبان میں مضامین لکھے اور بڑے بڑے مشاہیر پر اپنا اثر جما لیا، مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ناصری اتنی کروٹیں صرف اسلئے بدل رہا ہے کہ اسکو ایک کروٹ چین نہیں ملتا معلوم ہوتا تھا کہ اسکی رگ رگ میں جو فساد و انتشار ہے وہ اسکو مٹا کر رہیگا لیکن دو تین سال سے ناصری نے اپنی علمی و ادبی زندگی کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہدیا تھا۔

اس دوران میں اس نے نہ ایک حرف انگریزی میں لکھا تھا اور نہ اردو میں طرح طرح کے وہم میرے ذہن میں آرہے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ یا خدا ناصری کو کیا ہو گیا ہے کہ اس طرح بلا کسی تمہید کے دفعتہً اس نے سکوت اختیار کر لیا۔ ایک عرصے تک مجھے اسکی کوئی خبر نہ مل سکی لیکن آخر کار خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ خلاف امید میرا اُس کا شب و روز کا ساتھ ہو گیا اور میری وہ آرزو جس کو مدت سے اپنے دل میں پرورش کر رہا تھا پوری ہو گئی۔

(۲)

میں جو کچھ بطور تمہید کے لکھ چکا ہوں۔ اس سے بہت کچھ اندازہ کیا
جا سکتا ہے کہ ناصری کے ساتھ غائبانہ مجھے کس حد تک اُنس تھا چنانچہ
میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی، جب مجھے معلوم ہوا کہ لکھنؤ کے جس کالج
میں، میں انگریزی کا پروفیسر ہو کر جا رہا ہوں اسی میں ناصری دو سال سے
فلسفہ کی پروفیسری کر رہا ہے، مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ
جو شخص ناصری کی طرح سے آزاد روی اور جولانی طبع کا خوگر رہا ہو اسکا یوں
پابدامن ہو کر بیٹھ رہنا کم از کم میری سمجھ میں کسی طرح نہ آتا تھا۔ بہر حال میں نے
فوراً ارادہ کر لیا کہ کسی نہ کسی حیلے سے لکھنؤ میں ناصری کے زیر سایہ رہونگا
اور اسکی صحبت سے جو کچھ فیض حاصل کر سکوں گا کروں گا۔ خود میری زندگی
میں کچھ ایسے واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا کہ میں سکون سے محروم ہو چلا
تھا، شب و روز آشفتگی و انتشار میں بسر کر رہا تھا اور ان دنوں ناصری مجھے
خصوصیت کے ساتھ یاد آ رہا تھا، مجھے معلوم تھا کہ ایسے وقت میں اگر کوئی
مجھے سکون دے سکتا ہے تو وہ "حدیث آرزو" اور "پراگندہ دل" کا
مصنف۔ میں لکھنؤ روانہ ہو گیا، ناصری کی صحبت کا خیال میری روح
میں بالیدگی پیدا کر رہا تھا۔

لکھنؤ پہنچ کر میں نے ایک ہوٹل میں عارضی طور پر قیام کیا، شام کو

نہا دھو کر پرنسپل سے ملنے سیدھا کالج گیا۔ وہاں اُس سے آدھ گھنٹے تک ضروری معاملات پر گفتگو ہوتی رہی اُس نے مجھے کچھ ہدایتیں دیں جن پر مجھے عمل کرنا تھا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اسی سے ناصری کا پتہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ گولہ گنج میں رہتے ہیں۔ میں نے احاطہ سے باہر آکر فوراً ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور ناصری کی تلاش میں چل کھڑا ہوا، جولائی کا مہینہ تھا۔ بات کی بات میں بادل گھر آئے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ لیکن مجھے تو اپنے "ہیرو" کی دُھن تھی، میں پانی پتھر سے کیا گھبراتا کچھ دیر تانگہ پر ادھر اُدھر سرگرداں پھرنے کے بعد مجھ کو اس کا مکان مل گیا جو تھا تو مختصر، لیکن اپنی وضع قطع کے لحاظ سے نہایت خوشنما تھا، برآمدہ میں ملازم تھا، میں نے اطلاع کرنیکو کہا وہ اندر گیا اور فوراً واپس آکر مجھے بلا لے گیا ایک چہل سالہ میانہ قد، دُبلا پتلا شخص جو اپنی کتابوں سے گھرا ہوا ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اپنی نگاہوں کو یکسر سوال بنائے ہوئے میرے استقبال کو اُٹھا اور مصافحہ کر کے مجھ کو سامنے کی کرسی پر بٹھا لیا۔ صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ ناسازگار اتفاقات کے ہاتھوں بُری طرح مٹ چکا ہے جسکا اثر اسکی صحت جسمانی پر بھی پڑا ہے۔ آنکھوں میں ایک ناقابل بیان گہرائی تھی جس کی تشریح تو ممکن نہیں۔ اتنا کہہ دینا کافی سمجھئے کہ مجھے ناصری کی آنکھیں وحشت انگیز معلوم ہوئیں۔

ناصری سے پہلی گفتگو جو ہوئی وہ بڑی حد تک مایوس کن تھی اور میری امیدیں برباد ہوتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص میں کسی کے ساتھ خلوص و ہمدردی رکھنے کی صلاحیت نہیں ہے اسکو جب معلوم ہوا کہ میں کس غرض کو لیکر اس سے ملنے آیا ہوں تو اس نے ایک نرم لہجے میں جو مصنوعی معلوم ہوتا تھا کہا:۔

"آپ کے دل کو جو تعلق میری ذات سے ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ شکریہ میں میں بھی ایسی ہی محبت کا اظہار کروں لیکن آپ کو غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے اگر میں کہوں کہ میں اپنے اندر وہ جذبات نہیں پاتا جن کو محبت سے تعبیر کیا جاتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ان جذبات کی کوئی اصلیت نہیں۔ کم از کم میرے لئے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، آپ میں اور مجھ میں عمر کے لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر اپنے تجربات سے آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچ جائیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مجھ میں اور آپ میں رفاقت نہیں ہو سکتی آپ بے تامل ہوٹل سے اپنا سامان قیام یہاں لے آئیے اور رہیئے، آپکے ذوق علم و ادب سے امید ہے کہ آپ سے میری تکان بھی دور ہوتی رہے گی۔ صرف اسقدر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس رفاقت پر نہ مجھ کو پورا اعتماد کرنا چاہیئے نہ آپ کو انسان کی طبیعت تغیر پذیر ہے تلون انسان کے خمیر میں ہے، اور مجھ میں اور آپ میں بھی اختلاف پیدا ہو جانا کوئی حیرت ناک امر نہ ہوگا۔

ایسے لمحے کے لئے ہم دونوں کو تیار رہنا چاہیئے۔ لیکن اس سے ہماری موجودہ صحبت کو بد مزہ بھی نہ ہونا چاہیئے، ان باتوں کو اگر آپ سمجھ کر میرے ساتھ رہیں گے تو دونوں کی اس میں فلاح ہے۔ اب آپ جایئے اور بستر وغیرہ لے آیئے"۔

ناصری نے اپنی تقریر کا سلسلہ ختم کیا تو میں اُس کا منھ تکتا رہ گیا۔ مجھے اسکے انداز گفتگو سے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی مگر مایوسی ضرور ہوئی۔ اس پر بھی ناصری کے ساتھ جو شیفتگی مجھ کو پہلے سی تھی اس نے مجبور کیا کہ اُسی کے ساتھ رہوں اور میں بلا کچھ سوچے سمجھے آ کر ناصری کے مکان میں رہنے لگا۔ ناصری نے مکان کا نصف حصہ مجھے دیدیا۔ لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ اُس نے کرایہ میں میری شرکت گوارا نہ کی۔ مجھے اس خیال سے تکلیف ہو رہی تھی۔ ناصری نے فیصلہ کن لہجے میں کہہ دیا تھا:۔

"اگر میرے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرنا تھا تو آپ کو ہوٹل ہی میں رہنا چاہیئے تھا"۔ میرے لئے سوا خاموشی کے کوئی چارہ نہ تھا۔

ناصری سے میں روز بروز زیادہ مایوس ہوتا جاتا تھا۔ میں نے غائبانہ اسکی بابت جو رائے قائم کر رکھی تھی وہ اسکے بالکل برعکس تھا۔ خیالی ناصری اور اصلی ناصری میں بعد المشرقین نظر آ رہا تھا۔ میں نے ناصری کو اسکی نظموں

اور فسانوں سے "عشقِ مجسم" سمجھ رکھا تھا اور اس لئے اس سے میری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ محبت کے متعلق اس کے نت نئے نظریے جو میری نگاہ سے گزر چکے تھے' ان سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ شخص کسی "برباد محبت" کو محبت کے رموز سے آگاہ کر کے از سرِ نو بنا سکتا ہے لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں ایسی چیزوں کا ذکر کرنا بے محل ہے۔ دو تین ماہ مجھے ناصری کے ساتھ رہتے ہو گئے تھے اس درمیان میں صرف ایک بار محبت کا ذکر آیا تھا، ناصری نے جس تلخ اور حقارت آمیز لہجے میں اس موضوع پر بحث کی اس سے میرا دل بیٹھ گیا، ناصری کے سینے میں یا تو واقعی دل کی جگہ پتھر کی سل تھی یا پھر وہ کوئی ایسی ہستی تھا جس کو ہم لوگ سمجھ نہ سکتے تھے، مجھے اب بھی ایک حد تک یقین تھا کہ ناصری "اہلِ دل" ہے، اگرچہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے اپنے کو برافگندہ نقاب منظرِ عام پر لانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر یہ یقین نہ ہوتا تو ناصری کی صحبت میرے لئے عذاب ہو جاتی مجھے اُسکے متعلق یہ حُسنِ ظن کیوں تھا؟ اس کے مختلف اسباب تھے۔ ایک تو شاعر، افسانہ نویس اور نقاد ناصری کا جو نقش پہلے سے میرے دل پر بیٹھ چکا تھا وہ کسی طرح نہ مٹتا تھا، اسکے علاوہ اسکی موجودہ زندگی بھی اسکی "حُسن شناسی" اور "ذوقِ جمال" کا کافی پتہ دیتی تھی، اس کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا آجتک میں نے اسکے بالوں کو کبھی درست نہیں دیکھا۔ حجامت بنانے میں اس کا

کوئی معمول نہ تھا، اکثر میں دبی زبان سے کہہ دیتا تھا۔ "آپ کی حجامت بہت بڑھ گئی ہے بنوا ڈالیے" کبھی تو وہ میرے کہنے پر بلا تامل عمل کر لیتا تھا اور کبھی میری صلاح کو قابل توجہ بھی نہ سمجھتا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ پورا "لاابالی" تھا لیکن ان سب "ندرتوں" کے باوجود اس کا کمرہ جس سلیقہ سے آراستہ رہتا تھا وہ اسکی حسن لطیف کی بیّن دلیل تھی۔ روز صبح کو وہ اپنی کتابوں کو خود جھاڑن سے صاف کرتا تھا۔ اس کام میں ناصری کو کسی کے اوپر اعتماد نہ تھا، اسکے کمرے میں جتنی تصویریں تھیں وہ عامیانہ مذاق کی نہ تھیں بلکہ صناعی کی بہترین مثالیں تھیں، ان سب باتوں کو بھی جانے دیجیے، ناصری جس وقت شاعری کے فلسفہ سے بحث کرنے لگتا تھا یا کسی مشرقی یا مغربی شاعر پر تنقید کرتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف شاعری کے راز سے آشنا ہے بلکہ زندگی کی حقیقت پر بھی عبور رکھتا ہے اُسکا عقیدہ تھا کہ وہ شعاع جو زندگی کی روح رواں ہے مغربی شاعری کی گرفت سے بچکر نکل جاتی ہے اس لئے کہ وہ اپنی استدلالیت کا پھندا ڈال کر اسکو پکڑنا چاہتا ہے۔ یہی شُعاع خود بخود اپنے کو مشرقی شاعری کی آغوش میں دیدیتی ہے۔ کیونکہ وہ کبھی اس کو پکڑنے کی کوشش نہیں کرتا جو پکڑنے کی چیز ہی نہیں مشرقی شاعری کی امتیازی خصوصیت "وجدانیت" ہے اور مغربی شاعری کی عقلیت۔ ناصری اکثر غیرارادی طور پر اشعار پڑھا کرتا تھا۔ یہ اشعار نہ صرف اسکی

نقادی کی بلند معیاری پر دلالت کرتے تھے بلکہ اسکی ہستی کی پوشیدہ ترین تہوں کو کھول کر رکھ دیتے تھے۔

معلوم ہوتا تھا کہ جو زمانہ ناصری پر سے گزر چکا ہے وہ اپنا ایک بھوت چھوڑ گیا ہے جو ناصری سے ہر وقت لپٹا رہتا ہے میرا یہی یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ عشق و محبت کا پتلا ہے اور اسکا دل صرف جذبات کے گداز سے بنا ہوا ہے۔ مگر اس یقین کو قوی کرنے کے لئے مجھے کوئی ظاہری وجہ نہ ملتی تھی۔ بلکہ برخلاف ناصری نے ہمیشہ محبت اور حسن سے اپنی بیگانگی ہی ظاہر کی، میں عجیب کشمکش میں تھا، وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑا تھا، میری ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس سے کسی دن صاف صاف گفتگو کروں، اسکی طرز تنقید سے بھی ڈرتا تھا کہ وہ اپنی جارحانہ بحث سے کہیں مجھے آزردہ نہ کردے۔

ہاں تو وہ واقعہ جس پر محبت کی بحث چھڑ گئی تھی یوں تھا، یوں تو کالج میں ہر پروفیسر ناصری کی قابلیت اور ذہانت کا قائل تھا لیکن عموماً لوگ اس سے جلتے تھے اسکا بہت بڑی حد تک ناصری خود ذمہ دار تھا۔ اسکو جب کبھی موقع ملتا تو وہ کسی پر اعتراض کر بیٹھنے میں مطلق دریغ نہ کرتا، اس کو کسی کی دل شکنی کی پروا نہ تھی، میرے سوا اگر کوئی تھا جو ناصری کو واقعی چاہتا تھا وہ شیام منوہر تھے جو نفسیات کے پروفیسر تھے۔ وہ خود بھی بے انتہا قابل تھے لیکن ناصری کو ہر حیثیت سے برتر مانتے تھے، انکی

عمر اٹھائیس سال کی تھی، مجھ سے ایک سال بڑے تھے۔ انکو شاعری سے بڑا شغف تھا، خود بھی شعر کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے۔ شادی ابتک نہیں ہوئی تھی، مجھ میں اور ان میں سب سے زبردست مشترک عنصر یہی تھا یہی ایک پروفیسر تھے جو ناصری سے بے تکلف تھے اور اس کو تم کہکر مخاطب کرتے تھے، ناصری کو بھی اس سے خاص تعلق تھا، شیام منوہر روز ہمارے مکان پر آتے تھے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے، مختلف مباحث پر گفتگو ہوا کرتی تھی، ناصری اپنے اچھوتے خیالات سے ان کو مسرور کیا کرتا تھا کبھی کبھی اختلاف بھی ہو جاتا تھا اور دونوں جھگڑ بیٹھتے تھے یا پھر ہم تینوں سنیما چلے جاتے تھے اور وہاں ناصری کی نقادی خاص چیز ہوا کرتی تھی "ماجرا" (پلاٹ)، افسانوں کی نوعیت، تصویروں کی صناعی، ایکٹنگ ہر چیز پر وہ اپنی رائے دے دیتا تھا اور ہم لوگوں کے خیالات میں اس سے کچھ نہ کچھ ترمیم یا اضافہ ضرور ہوتا تھا۔

ایک روز شیام منوہر پانچ بجے شام کو آئے اور کہنے لگے "چلو سنیما دیکھ آئیں" آج وہ کسی قدر افسردہ و ملول نظر آرہے تھے۔ ناصری نے لب و لہجہ میں ایک غیر مانوس پژمردگی پائی اور پوچھا:-

کیوں منوہر آج متفکر کیوں ہو؟"

شیام منوہر نے جواب دیا: "کچھ نہیں"۔

مگر ان کے "کچھ نہیں" سے پایا جاتا تھا کہ بہت کچھ ہے میں کہہ چکا ہوں کہ ناصری کو شیام منوہر سے بڑا اُنس تھا، اس کو کسی قدر تشویش ہوئی اسلئے کہ شیام منوہر کی شگفتگی ضرب المثل تھی ان کی صحبت دوسروں کو شگفتہ کر دیتی تھی، آج ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ یہ تشویش کی بات تھی مگر ناصری اپنی تشویش کو بہت زیادہ نمایاں نہیں کیا کرتا تھا اُس نے کہا۔ "ممکن ہے مجھے دھوکا ہوا ہو"۔

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "ظہیر تم بتاؤ یہ فکرمند ہیں یا نہیں"؟ میں نے کہا۔ "ہاں کچھ معلوم تو ہوتے ہیں"۔

شیام منوہر خاموش رہے، ناصری نے چاء منگائی۔ چاء پیتے ہوئے وہ بار بار ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ شیام منوہر کے چہرہ پر ڈال لیتا تھا اور کچھ جاننا چاہتا تھا۔ شیام منوہر ہماری باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے نہیں معلوم ہوتے تھے، وہ رہ رہ کر کسی خیال میں گم ہو جاتے تھے۔ ناصری کبھی میری طرف دیکھتا تھا کبھی انکی طرف، کچھ دیر یونہی گزری ہو گی کہ شیام منوہر نے خودبخود کہا:۔

ناصری مجھے تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ اگر آج کی کیفیت سے تم کو آگاہ کروں تو تم مجھ کو اپنی جرح و تعدیل سے خراب کر دوگے۔ اگر رسکن اور کارلائل کے دقیق خیالات نہ سمجھ میں آتے ہوں تو تم سے سمجھے، روسیو، ورڈسورتھ اور

رومی کا تصوف تم سمجھ اور سمجھا سکتے ہو، افلاطون سے لیکر ابتک جتنے حکما گزرے ہیں اُن سب کے نکات تم بتا سکتے ہو شیلے اور بیدل کی ناآسودگی کا راز تم کو معلوم ہے لیکن .... "

شیام منوہر رُک گئے۔ ناصری نے مسکرا کر کہا:۔

"معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے"

اور اس میں شک نہیں کہ اس کی مسکراہٹ جارحانہ تھی۔ شیام منوہر جوش میں تو تھے ہی ان کو جلال آ گیا کہنے لگے۔ "ہاں لڑی ہے اور بُری طرح لڑی ہے، آج مجھے معلوم ہوا کہ ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھنے کی ہوس کیوں کر ہو سکتی ہے۔ رات بھر میں نے جس کرب و اضطراب میں بسر کی ہے اسکا حال میرا دل جانتا ہے"۔

ناصری نے بات کاٹ کر کہا۔ "آخر کیا دیکھا جس کے دیکھنے کی دوبارہ ہوس ہے اور جس نے سکون سے آپ کو اس طرح محروم کر رکھا ہے بتایئے ممکن ہے کچھ "حاتمی" آپ کے ساتھ کی جا سکے"۔

شیام منوہر نے کسی قدر درشتی سے کہا۔ "آپ اپنی "حاتمی" اپنے پاس رکھیے یہی بہت ہے کہ میرے جذبات کے ساتھ تمسخر نہ کیجئے۔ کل میں بد نصیب شام کے وقت بنارسی باغ جا نکلا پھر جو کچھ دیکھا اسکے بیان کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں، پورے ایک گھنٹے تک ایک زہرۂ ارضی کو دیکھتا رہا وہ بھی بار بار

میری طرف دیکھتی رہی، غالباً میری محویت کو محسوس کر رہی تھی۔ جب وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی تو تھوڑی دیر تک مجھے ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی، رات بھر اسی کی صورت مجھے ستاتی رہی۔ مجھے یہ ایک نیا تجربہ ہوا جو باوجود اپنی تلخی کے دلکش اور روح افزا معلوم ہوتا ہے، یہ تجربہ میرے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک متموّل تعلیم یافتہ کھتری گھرانے کی لڑکی ہے جس نے اسی سال بی۔ اے پاس کیا ہے"۔

ناصری واقعی بڑا جلا دتھا کہنے لگا، اچھا بتاؤ تم اپنی جل پری کو بغیر دیکھے ہوئے کب تک اس بیتابی اور ہوس کو قائم رکھ سکتے ہو؟"

شیام منوہر کا ضبط جاتا رہا، ہونٹ کانپنے لگے، آواز بھرا گئی انھوں نے جواب دیا۔ "ناصری تم انسان نہیں حیوان ہو۔ میں نے یہ کب دعویٰ کیا کہ میرے جذبات کی شدت میں کبھی تخفیف نہ ہو گی یا امتدادِ زمانہ کا اثر مجھ پر نہیں ہو گا لیکن اسکے معنی یہ تو نہیں ہوئے کہ محبت کوئی چیز نہیں"۔

ناصری نے فوراً کہا۔ "ہاں اس کے یہی معنی ہوئے جب آپ حادثات زمانی و مکانی کے ہاتھوں اس طرح مجبور ہیں تو آپ پھر کسی چیز کو ایسی غیر معمولی اہمیت کیوں دیتے ہیں؟ جہاں ہر چیز رفتنی ... و گذشتنی ہے وہاں محبت بھی رفتنی و گذشتنی ہے جہاں ہر چیز مایا ہے وہاں محبت بھی مایا ہے، زمانہ کی فتح قطعی ہے پھر آپ محبت کا نام کیوں لیتے ہیں زیادہ سے زیادہ آپ اپنی نفسیات کی اصطلاح

میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک خاص ہیجان ہے جو ایک قسم کا ہیجان آپ کے اعصاب میں پیدا کر رہا ہے سو میرا خیال ہے کہ یہ ہیجان ہر عورت پیدا کر سکتی ہے اور ہر عورت اس کو آسودہ کر سکتی ہے کیونکہ یہ ہیجان متعلق ہے بقائے نسل کی خواہش سے یہاں حُسن و عشق کا کام نہیں، آپ اس جذبے کو کسی خاص ہستی سے کیوں وابستہ کرتے ہیں؟ اس کے علاوہ ذرا آپ سوچیئے تو کہ اگر آپ کو یہ امید نہ ہوتی کہ اس "زہرۂ ارضی" پر قابو پانا ممکن ہے تو کیا اس حالت میں بھی آپ اس کے اسی طرح گرویدہ ہو سکتے تھے، آخر آپ کسی حسین اور دلکش تصویر یا مجسّمے کے لئے کیوں نہیں تڑپتے، کیوں نہیں اپنا دل کھاتے فرض کیجیئے کہ اسی عورت کو کسی تصویر کی صورت میں دیکھتے اور آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ محض ایک تصویر ہے یعنی اسکی اصل کا کہیں وجود نہیں ہے تو کیا آپ اس وقت بھی اس کی محبت میں گھلنے کا دعویٰ کر سکتے تھے؟ اگر نہیں تو پھر یہ محبت کی افترا پردازی کیوں "خرافات یونان" میں ایک بادشاہ کا افسانہ ہے جس کا نام پگمیلین تھا وہ سنگ تراش تھا اپنی دلچسپی کے لئے مجسّمے تیار کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے ایک ایسی حسین و جمیل عورت کا مجسّمہ بنایا کہ خود اس پر فریفتہ ہو گیا اور دن رات اسی کی پرستش میں مبتلا رہنے لگا۔ اس عشق و محبت کا میں قائل ہو سکتا ہوں مگر اس کا کوئی وجود نہیں یہ تو صرف ایک شاعر کے دماغ کی پیداوار ہے اس پر بھی انسان کی مادہ پرستی

دیکھئے کہ ایک صناع کو بھی آخر اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا مجسمہ ایک چلتی پھرتی عورت میں تبدیل ہو جائے اس کے لئے اس نے حُسن کی دیوی زہرہ کی کیسی کیسی خوشامدیں کیں اور آخر کار جو چاہتا تھا اُسے حاصل کر کے چھوڑا، مختصر یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محبت آپ کس بلا کو کہتے ہیں، مجھے تو سب ڈھکوسلا نظر آتا ہے"۔

ناصری نے بڑی رحمی کے ساتھ محبت کو افترا پردازی ثابت کر کے رکھ دیا۔ شیام منوہر نے سکوت اختیار کر لیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا۔ "آپ تو ان واردات و کیفیات کو جو جسم انسان کے نازک ترین حصے یعنی دل سے متعلق ہیں اس طرح لغو ثابت کرتے چلے جاتے ہیں کہ گویا آپ کے سینے میں دل ہی نہیں"۔

ناصری کو شاید مجھ سے ان کلمات کے سُننے کی امید نہ تھی وہ ایک بار کسی قدر متحیر ہوا مگر پھر اپنے ابرُوں کو درست کر کے ایک ترش تبسّم کے ساتھ جواب دیا سہ

بہت شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا"

شیام منوہر عاجز ہو چکے تھے جھنجھلا کر بولے "اس جراحی سے بہتر ہے کہ اب آپ خاموش رہیے"۔

ناصری خاموش ہو گیا اور بڑی دیر تک خاموش رہا یہاں تک کہ شیام منوہر اُٹھ کر چلے گئے۔ سینما کا وقت نکل گیا تھا اور کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ ناصری کسی خیال میں محو ہو گیا تھا، میں بھی اپنے کمرے میں چلا آیا اور سوچنے لگا۔ یا خدا یہ کس قسم کا انسان ہے جو باوجود اپنی شاعری اور نازک خیالی کے ان جذبات سے یک قلم عاری معلوم ہوتا ہے جو انسان اور خصوصاً ایک شاعر کی روحانی غذا بتائے گئے ہیں۔ ضدین کا یہ اتصال کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شیام منوہر کی روداد محبت میں اور کچھ کہنا نہیں ہے۔ صرف اس قدر بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے بڑی سرگردانیوں اور ریشہ دوانیوں کے بعد اپنی جل پری سے شادی کرلی۔ ناصری سے اور اُن سے جو بدمزگی ہو گئی تھی وہ دیرپا نہ تھی۔

۳

مجھے لکھنؤ میں رہتے ہوئے ایک سال سے کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ اس درمیان میں مجھ کو اب تک نہ موقع ملا اور نہ ہمت ہوئی کہ ناصری کی زندگی کے حالات خود اس سے دریافت کروں، دوسروں سے صرف اس قدر معلوم ہو سکا تھا کہ پانچ برس ہوئے کہ اسکی بیوی مر گئی اور وہ ایک مدت سے اپنے ماں باپ اور خاندان کے تمام لوگوں کو چھوڑے ہوئے ہے کبھی بھول کر بھی گھر کی طرف رُخ نہیں کرتا، لوگوں کا قیاس تھا کہ شاید باپ وغیرہ سے

کچھ بگاڑ ہے اس سے زیادہ میں ناصری کے متعلق کوئی اور خاص بات نہ جانتا تھا رفتہ رفتہ مجھ پر یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ ناصری میرے خلوص اور قلبی لگاؤ کی قدر کرتا ہے اور کم از کم ان جذبات کو وہ فضائل انسانی میں شمار کرتا تھا۔ اگرچہ پہلے دن اس کے انداز گفتگو سے ٹپکتا تھا کہ وہ ان جذبات کو بھی آنی وفانی سمجھتا ہے اور ان کو کوئی خاص وقعت دینا نہیں چاہتا۔ میں نے اب یہ فیصلہ کر لیا کہ کسی دن جب اسکو شاعری کی لطیف دنیا میں محو پاؤں گا تو میں اس سے اس کی زندگی کے سارے واقعات دریافت کروں گا اور میری جو قدر و منزلت اس کی نگاہ میں تھی اس سے مجھے امید تھی کہ وہ میری خواہش کو رد نہ کریگا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میرے نام ہندوستان کا ایک مشہور اُردو رسالہ آیا اس میں ایک افسانہ چھپا تھا جس کا عنوان "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" تھا۔ افسانہ اپنی خاص نوعیت رکھتا تھا۔ اسلوب بیان بھی دلکش تھا۔ بہرحال مجھے بے انتہا پسند ہوا۔ میں نے سوچا کہ ناصری کو چل کر سناؤں اور اس سے پوچھوں کہ کیسا افسانہ ہے، جاڑے کا موسم تھا، شام ہو چکی تھی۔ ناصری اپنے کمرے میں میز پر بیٹھا ہوا رباعیات سرمد پڑھ رہا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر کہا:۔

"آؤ ظہیر میں ابھی تم کو بلانے والا تھا۔ تم نے صحابیت شعری

اس قدر ہے کہ جب میں کسی شعر پر وجد کرتا ہوں تو جی چاہتا ہے تم
بھی ساتھ ہو اور ساتھ وجد کرو"۔

آج وہ عجیب عالم میں تھا اور جس طرح آج اُس نے مجھ کو سرفراز کیا کبھی
اور نہیں کیا تھا اس کے بعد سرمد کا یہ شعر پڑھا ؎

از شامت غفلت نہ رسیدم بہ وصال
عمرم ہمہ در دوری جاناں بگذشت

شعر سُن کر مجھ پر بھی ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ ناصری نے کہا۔
"بادی النظر میں کتنا معمولی شعر ہے۔ کیسی بات کہی ہے۔ ہم آپ روز
اس قسم کے گلے کیا کرتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ ہم واقعی روتے ہیں" دوری جاناں" کو
سمجھتے ہیں کہ واقعی مٹا دینے والی چیز ہے اور اس لئے اُس سے اس طرح
ڈرتے ہیں کہ گویا کوئی آسمانی بلا ہے۔ برخلاف اس کے شاعر کو دیکھیے کہ
اس دوری جاناں میں اپنا سارا سرمایۂ زندگی لُٹا کر رکھ دیا اور پھر اس لہجے میں
اس کا ذکر کرتا ہے کہ گویا جس چیز کو آپ بربادی سے تعبیر کرتے ہیں اُس
چیز نے اس کی روح میں ایک ایسی بالیدگی پیدا کردی ہے جس نے
اس کو اپنی داستان فخر و ناز کے ساتھ بیان کرنے کے قابل بنا دیا۔
اس وقت مجھے خواجہ حسن اللہ بیان کا ایک شعر یاد آگیا اس میں بھی
یہی خصوصیت ہے۔ کہتا ہے:-

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کہ مثل خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

شاعر کے تیور کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنی پامالی کی سرگزشت کو قابل احترام سمجھتا ہے۔ شاعر کی یہی ادا ہے جو اُس کو عوام الناس سے ممتاز رکھتی ہے جو اس کو اُلٹی سانسوں میں ملتی ہے وہ تم کو جنت کی ہوا میں بھی نہیں مل سکتی، تم بھی دوسروں کی طرح سمجھتے ہو گے کہ میں عشق و محبت کی قدر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ لیکن ظہیر میں کسی کے جذبات محبت کی داد کیا دوں۔ میں تو بس شاعر کے عشق کو عشق سمجھتا ہوں جو قیود مکانی و زمانی سے آزاد ہے، جس کے لئے مادیات کی حاجت نہیں جو وصل کا پابند نہیں۔ جس میں اگر ہجر کا گلہ بھی ہوتا ہے تو وہ اس لہجے میں گویا شکریہ ہے۔ ایسا عاشق ہر حال میں مسرور رہتا ہے۔ اس کا یہ قولِ سرمد ایمان یہ ہوتا ہے کہ:۔

سودا کہ دلم کرد تمامش سود است

یہ عشق دنیا میں نایاب ہے اور میں کسی اور عشق سے مرعوب نہیں ہوتا۔" ناصری نے اپنی پُرجوش تقریر کا سلسلہ ختم کر دیا۔ آج وہ مجسم سوز و گداز تھا۔ میں نے اس کو اس سے پہلے اس عالم میں نہیں دیکھا تھا۔ اسکے بعد اُس نے سرمد کی روداد عشق پہ سرسری طور پر کچھ کہا جس سے معلوم ہوا کہ

وہ اس کے سودائے محبت کا دل سے احترام کرتا تھا، اس سلسلے میں ناصری کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر میرے دل کو بڑی تسکین ہوئی۔

"عشق تو دراصل وہ چیز ہے جو انسان کو ملائکہ سے بھی زیادہ برگزیدہ بنا سکتی ہے، اس سے انسان کی ہستی جِلا پاتی ہے لیکن انسان نے بھی اپنے کو کیسا آلودہ بنا ڈالا ہے۔ لوگ جب محبت کا ذکر کرتے ہیں تو میں چڑھ اس لئے جاتا ہوں کہ وہ خواہ مخواہ ایک "گوشت و پوست" کے ہیجان کو محبت کہتے ہیں:۔

"جنون نداری و آشفتہ خطا اینجا ست"

آج بہترین موقع تھا کہ میں ناصری کے متعلق جو کچھ اتنی مدت سے جاننا چاہتا تھا اس کو کما حقہ جان لوں عشق و محبت کے بارے میں تو اس نے خود میرے شبہات رفع کر دئے تھے مگر ان حوادث سے میں بالکل ناواقف تھا جنھوں نے اس کو اسقدر رنجیدہ مغز بنا دیا تھا۔ میں اس کے سامنے اپنا سوال پیش کرنے والا تھا ہی کہ اُس نے میرے ہاتھ میں رسالہ دیکھ کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے"؟

میں نے کہا۔ "اس میں ایک افسانہ شائع ہوا ہے جسے آپ کو سُنانا چاہتا ہوں۔ عنوان "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" ہے۔"

عنوان سُن کر اس نے کہا۔ "آپ مجھے یہ نہ سُنائیے۔ میرے لئے

اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی"۔

میں نے پوچھا۔ "کیوں ؟"

اُس نے جواب دیا۔ "شکست کی آواز کا مجھ پر کوئی اثر ہوتا ہی نہیں اور نہ اس میں کوئی اثر ہوا کرتا ہے یہ تو انسان کی کم ظرفی کی دلیل ہے میں تو "شکست بے صدا" سے متاثر ہو سکتا ہوں جب کبھی غالب کا یہ مصرعہ میرے ذہن میں آتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ بیدل کا یہ مصرعہ بھی یاد آجاتا ہے :-

شکستن ہم نہ بُرد از شیشۂ من بے صدا ئیہا

یہ شکست البتہ ایسی ہے جس پر ناز کرنا چاہیئے"۔

میں یہ سُن کر بیتاب ہو گیا۔ اب زیادہ دیر تک صبر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ناصری صاحب آپ مجھ سے بزرگ ہیں اس لئے اب تک آپ سے دل کی بات نہ کہہ سکا لیکن خدا کیلئے مجھ کو زیادہ عرصے تک دھوکے میں نہ رکھئے، میں آپ کے پاس اس لئے آیا تھا کہ شاید آپ کے تجربات زندگی سے مجھے بھی کچھ سکون ہو۔ مجھ کو نہ جانے کیوں یہ یقین تھا کہ اگر مجھ کو کوئی تسلی دے سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ میں بھی خدا کے سیکڑوں بندوں کی طرح اطمینان قلب سے محروم ہو چکا ہوں جس بات کو

اب تک اپنی زندگی سمجھتا تھا جس سے جدا ہو کر مجھے یقین تھا کہ میں کبھی سانس نہیں لے سکتا اس کو سپردِ خاک کئے چلا آ رہا ہوں اور زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جی رہا ہوں۔ ناصری صاحب میں آپ کی زندگی کے حالات جاننا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے ان سے میں خود کچھ سیکھ سکوں اور آخرکار اُس سکون کو حاصل کر لوں جس سے محروم ہو چکا ہوں اسکے بعد میں نے اپنی سرگزشت مختصراً بیان کر دی، ناصری نے میرے ہر لفظ میں بوئے خلوص پائی وہ مجھ کو تھوڑی دیر تک غور سے دیکھتا رہا پھر پوری ہمدردی کیساتھ بولا۔

"ظہیر میرا دل کہتا تھا کہ تم بھی کسی نہ کسی طرح سے مٹ چکے ہو۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ تم میں اسقدر گھلاوٹ کہاں سے آئی، تم نے غلطی کی جو اب تک اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ میری زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں جسمیں ہر شخص کو دلچسپی پیدا ہو سکے مگر تم اُس کو جاننے کے آرزومند ہو تو ضرور تم کو اپنی رام کہانی سناؤں گا لیکن آج مجھ کو معذور سمجھو۔

سنائیں گے جو کبھی دل پر اختیار ہوا"

میں ناصری کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ کیا ناصری کو عام طور سے اپنے دل پر اختیار نہیں رہا کرتا؟ کیا درحقیقت اُس کا سکون ہنگامہ بآغوش رہتا ہے؟ مجھے تو اُس کے "بت در آستیں" ہونے کا شروع ہی سے یقین تھا اگرچہ اُس کا لباس دین "رہ رہ کر مجھ کو دھوکا دے دیتا تھا، میں نے

بھی اس وقت ناصری سے اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا اور صبر کے ساتھ اس گھڑی کا انتظار کرنے لگا جب وہ خود اپنی داستان سنانیکے قابل ہو جائے



ناصری ایک نحیف الجثہ آدمی تھا۔ اس پر تندرستی بھی خراب تھی، روز کوئی نہ کوئی شکایت لگی رہتی تھی۔ مگر اُس کو اس کی کوئی فکر نہ تھی، مجھے اسکی صحت کی طرف سے ہمیشہ اندیشہ لگا رہتا تھا اور آخر کار میں جس بات سے ڈر رہا تھا وہ ہو کر رہی۔ ایک بار ناصری کو تقریباً ایک ہفتہ تک شدید تپ چڑھی رہی۔ اس کے بعد ہلکی سی حرارت رہنے لگی۔ کھانسی کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ کچھ دنوں کیلئے کالج سے رخصت لیکر آرام کرنا بہت ضروری ہے۔ ناصری نے مسکرا کر کہا:۔

"اب میں عنقریب ہمیشہ کیلئے آرام کرنے والا ہوں"۔

اس کے جملے سے یاس و حسرت ٹپک رہی تھی۔ اگرچہ وہ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا اور ناصری کی حرارت نہ اُتری۔ غذا صرف نام کو رہ گئی تھی۔ ضعف رفتہ رفتہ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اب وہ پلنگ سے اُتر کر مشکل سے چار قدم چل سکتا تھا، ایک دن صبح چھ بجے جب کہ میں سو رہا تھا، ناصری نے مجھ کو پکارا۔ میں اٹھ بیٹھا، اُس نے کہا "نوکر سے

کہہ دو کہ چائے وغیرہ لے آئے۔"

نوکر چائے لے آیا۔ میں نے ایک پیالی بنا کر اس کو دی ایک خود پینے لگا۔ ناصری نے چائے پیتے ہوئے کہا:۔

"ظہیر! یہ روگ موت کا روگ ہے۔ مجھے اب زیادہ دنوں تک اس دنیائے گرد و باد میں رہنا نہیں ہے۔ میں آج چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے واقعات تم سے بیان کر دوں جن کے سننے کے تم اتنے دنوں سے مشتاق ہو۔"

میں نے خود اب تک اس کو بے محل سمجھا تھا کہ ناصری کو اس کا وعدہ یاد دلاؤں۔ آج وہ خود اپنا وعدہ وفا کرنا چاہتا تھا۔ میرے لئے اس سے زیادہ دلچسپی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ مگر اس کی صورت پر جو حسرت برس رہی تھی وہ میرے اعصاب کو بے قابو کر رہی تھی۔ ناصری کا ضبط و تحمل میرے دل میں گھر کر چکا تھا۔ جتنا ہی زیادہ وہ ضبط و تحمل سے کام لیتا اتنا ہی میرا دل اس پر رویا کرتا۔

میں نے کہا "ناصری صاحب کہیں آپ کو تکان نہ ہو جائے رہنے دیجئے جب طبیعت ذرا بہ صحت ہو لے تو سنا دیجئے گا۔"

اس نے جواب دیا "صحت کا تو ذکر نہ کرو، اور نہ میں صحت کا طلبگار ہوں۔ لیکن آج میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو اپنی زندگی سے آگاہ

کروں"۔ یہ کہہ کر اس نے دوسری پیالی چائے کی مانگی اور پھر یوں شروع کیا۔

"قبل اس کے کہ میں اُس مسعود زمانے کا مفصل ذکر کروں جس میں میں زندگی کے راز سے آگاہ ہوا، ضروری یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ابتدائی عمر سے لے کر اب تک کی زندگی پر ایک اجمالی نظر ڈالوں اور یہ بتاؤں کہ بچپن سے میرے دماغ کی نشوونما کیسے ہوئی۔ غالباً اس کو ماننے میں تم کو کوئی عذر نہ ہوگا کہ بچپن سے میری طبیعت انوکھی تھی، میری سرشت میں بغاوت اور سرکشی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، ہوش سنبھالتے ہی جو بات سب سے پہلے میرے ذہن میں بیٹھی وہ یہ تھی کہ جس خاندان میں اور جس ماحول میں پیدا ہوا ہوں اس میں صرف وہ بدبخت پیدا ہوتے ہیں جن کو اپنے پچھلے جنم کی بدکرداریوں کے لئے سزائیں بھگتنا ہوتی ہیں اور اس سے بغاوت نہ کرنا بجائے خود ایک ایسا گناہ ہے جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ مجھ میں اور میرے گھر والوں میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ میں جس قدر سریع الحس اور نازک خیال تھا، اسی قدر وہ لوگ بے حس اور خیالات کے لحاظ سے بھدّے تھے، میرے جذبات جس قدر لطیف اور پاکیزہ تھے اسی قدر اُن کے جذبات کثیف اور عامیانہ تھے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ جن کو وہ لوگ جذبات کہتے تھے وہ میری اصطلاح میں جذبات نہ تھے بلکہ محض چند رسمی پابندیاں تھیں جو انسان کی روح کو

مردہ کر دیتی ہیں۔ تم اس کو شاعری یعنی مبالغہ نہ سمجھنا، یہ کسی دل جلے کے واردات قلب ہیں۔ میرا یہ دعوےٰ ہرگز نہیں کہ میں ان دنوں بھی فلسفہ کے نازک مسائل پر غور کیا کرتا تھا۔ میری قوت فکر اس قدر پختہ نہ تھی لیکن یہ دردناک احساس کہ میں غلط جگہ پیدا ہوا اسی وقت سے میری ساری ہستی پر چھایا ہوا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کمسنی اور بے شعوری کے زمانے میں بھی اکثر رنج و غصہ کی حالت میں میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا ہے کہ اللہ میاں نے نہ جانے کیوں مجھے اس گھر میں پیدا کیا! یہ بغاوت اور سرکشی مجھے باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی، میرے والد تھے تو نہایت تعلیم یافتہ مگر ان کی زندگی سر تا سر بے عنوانیوں پر مشتمل تھی اور قیامت یہ کہ وہ کسی دوسرے کی بے عنوانی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ میرے اندر ضد اور خود رائی کا جو عنصر تھا اُس کو مٹانے کے لئے وہ ہر وقت کوشش کرتے رہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ میری ضد بڑھتی گئی۔ میرے والد میری طبیعت کا اندازہ کئے بغیر مجھ پر تشدد کرتے تھے مجھے ان سے نفرت شروع ہو گئی، ان کو سارے خاندان سے دشمنی تھی، مجھے ساتھ ہی ساتھ ان سے بھی دشمنی ہو گئی اور یہ دشمنی روز بروز بڑھتی گئی۔

میرا خاندان مالی حیثیت سے خوشحال تھا اور میرے لئے ہر قسم کی

مادی آسائش موجود تھی مگر میں بےچین رہتا تھا، میں ایک نامعلوم چیز کیلئے بیتاب رہا کرتا تھا، نہ جانے کیا چاہتا تھا، شعلے کی طرح ایک ناقابل بیان تشنگی میری ساری ہستی کو جلاتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ میں بعض مرتبہ دل سے دعا کرتا تھا کہ یا خدا مجھے اس ناز و نعمت کی دنیا سے محروم کردے اور فلاکت و گداگری میں مبتلا کردے، میں یہ اسوقت کی حالت بیان کر رہا ہوں جب کہ میری عمر بارہ سال کی تھی اور میں اسکول میں پڑھتا تھا تم سمجھ سکتے ہو کہ اس عمر میں جس کی پراگندہ دلی کا یہ حال رہا ہو اس کی زندگی کیسی مصیبت میں رہی ہوگی۔ اُس وقت جس نے کچھ دنوں کے لئے میری گرتی ہوئی حالت کو سنبھال لیا وہ میری پھوپھی کی لڑکی زبیدہ تھی جو مجھ سے عمر میں ایک سال بڑی تھی اور جو خوبصورت ہونے کے علاوہ نہایت ہوشمند اور دوراندیش تھی۔ سب سے پہلے مجھ میں وہ شورش جس کو دنیا محبت کہتی ہے۔ زبیدہ ہی نے پیدا کی، نہ جانے مجھ میں اُس نے کون سی بات دیکھی کہ وہ میری طرف مائل ہو گئی۔ ان دنوں میرا معمول تھا کہ اپنی فرصت کا بیشتر حصہ کتب بینی میں صرف کرتا تھا یا پھر شہر سے بہت دور جمنا کے کنارے کنارے نکل جاتا، میں آگرہ کے تمام شہر میں "ویرانہ پرست" مشہور تھا۔ ظہیر! میں اپنے وطن میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا۔ نہ کوئی میرا دوست تھا نہ ساتھی۔ شروع شروع میں نے زبیدہ کی طرف

کوئی توجہ نہ کی بلکہ اُس سے بھاگتا رہا اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ وہ بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کو میں آہنمی سمجھتا ہوں لیکن زبیدہ نے رفتہ رفتہ مجھ پر یہ اثر ڈالنا شروع کہ میری طرح اس کی طبیعت بھی خاندان والوں سے مختلف ہے اور پھر میرا اس طرح تعاقب کرتی رہی کہ آخر کار مجھ کو رام کر کے چھوڑا، پھر تو میں اس کے ساتھ اس قدر محو ہوا کہ مجھے خود اپنے وجود کا بھی احساس نہیں رہا۔ یہ میرے لئے ایک نئی چاشنی تھی۔ میں زبیدہ کے اشاروں پر چلنے لگا اور یہ روش میرے لئے بڑی خیر و برکت کی چیز ثابت ہوئی، کچھ دنوں کے لئے میں اپنی اندرونی شورش، اپنی روح کے غیر واضح خروش کو بالکل بھول گیا، پانچ سال اسی مدہوشی میں گزر گئے زبیدہ کہتی تھی :-

"جبتک کہ مقلب القلوب میرے سینے میں اس دل کی جگہ کوئی دوسرا دل نہ رکھ دیگا میں تم کو اسی جوش کے ساتھ چاہتی رہوں گی، میری زندگی اگر کسی اور کے سپرد کی گئی تو میں مٹ کر رہ جاؤں گی"۔

اس "پیمان وفا" نے مجھے دین و دنیا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب میں اپنی زندگی میں نہ کوئی کمی محسوس کروں گا اور نہ بےچین رہوں گا لیکن یہ سب ایک بے بنیاد طلسم سے زیادہ پائدار نہ تھا مقلب القلوب نے زبیدہ کے سینے میں دوسرا دل رکھ ہی دیا۔ مجھے معلوم

ہو گیا کہ اس کو دراصل مجھ سے محبت نہ تھی بلکہ وہ اب تک مجھ سے صرف کھیل رہی تھی اس لئے کہ وہ اور کسی صورت سے اپنا دل نہ بہلا سکتی تھی، اس کی شادی کا ذکر ہونے لگا میرے دل میں ہوکیں اُٹھنے لگیں، مگر میں نے دیکھا کہ زبیدہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ بدستور گھر میں ہنستی کھیلتی پھرتی تھی اُس نے مجھ سے ایسا تجاہل برتا کہ گویا کبھی مجھ سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ یہ وہ صدمہ تھا جس نے میری رگ رگ کو ہلا دیا میری تمام شورشیں پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ عود کر آئیں اور میں کہیں کا نہ رہا۔ زبیدہ کی شادی ہوگئی اور وہ اس طرح خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگی کہ میں اس کو بددعائیں دینے لگا۔ ظہیر! اس کے بعد میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اُس کو اسکی مطلق پروا نہ تھی۔ مجھے دنیا میں صرف دو آدمیوں سے نفرت ہے، ایک تو زبیدہ سے، دوسرے اپنے باپ سے۔ میں ان دونوں کو بدترین خلائق سمجھتا ہوں۔"

ناصری نے سلسلہ توڑ دیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر کہا "چاء اور منگاؤ، کچھ تکان سی محسوس ہو رہی ہے"۔

چاء آئی اُس نے چاء کی پیالی ہاتھ میں لیکر پھر کہنا شروع کیا:۔

جس سال زبیدہ کی شادی ہوئی اُسی سال میں نے انٹرنس پاس کیا

میں یونہی ہر وقت گھبرایا کرتا تھا۔ ۲۴ گھنٹے میں ایک لمحہ بھی ایسا نہ گزرتا تھا جس میں مضمحل اور غمگین نہ رہتا ہوں، میری سوداویت روز بروز بڑھنے لگی۔

اس پر والد نے دوسرا ظلم یہ کیا کہ زبیدہ کی شادی کے چھ مہینے بعد میری طبیعت کے خلاف زبردستی میری شادی بھی کردی۔ میں مجبور تھا۔ کچھ کر نہ سکتا تھا۔ ورنہ جی تو یہ چاہتا تھا کہ باپ کا کام تمام کردوں۔ میں خود سکون سے محروم تھا آخر اس کے کیا معنی تھے کہ ایک اور ذی روح کی زندگی خراب کی جائے اور کسی سے تو میں اپنا انتقام لے نہ سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے بیوی سے نفرت پیدا ہوگئی، حالانکہ اس کی کوئی معقول وجہ نہ تھی، اب میری زندگی اور بھی تلخ ہونے لگی اور اگر میں شب و روز مطالعہ اور فلسفیانہ غور و فکر میں نہ مشغول رہنے لگتا تو یہ تلخی ناقابل برداشت ہو جاتی۔ سب سے زیادہ مصروفیت کے ساتھ شاعری میں نے اسی زمانہ میں کی ہے۔ اسکے بعد میں نے جو زندگی شروع کی اس کو مبہم طور پر صرف "اوباشی" کہوں گا۔ گزشتہ ناہموار و متلاطم زندگی کا اثر میری صحت پر کافی پڑ چکا تھا۔ اب تازہ بے عنوانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری صحت مستقل طور پر خراب رہنے لگی، یہاں تک کہ ایف، اے پاس کرنے کے بعد سلسلۂ تعلیم مجھے منقطع کر دینا پڑا۔

دو سال میں بری طرح بیمار رہا۔ جب حالت کچھ رو بہ اصلاح ہوئی تو میں نے چاہا پھر پڑھنا شروع کروں لیکن عین اسی موقع پر باپ سے

اور مجھ سے لڑائی ہوگئی اور میں ترک وطن پر مجبور ہوگیا۔ گزر اوقات کیلئے میں نے شاہجہاں پور میں ایک اسکول میں ملازمت کرلی اسی زمانہ میں مجھ کو افسانہ نویسی کا شوق ہوا، کتب بینی اور اوباشی سے جو فرصت ملتی تھی اس میں میں افسانہ لکھا کرتا تھا۔ وہ افسانے جن کے آپ اسقدر مداح ہیں، اسی دور کے کارنامے ہیں۔ تین سال کے بعد میں نے گھر بیٹھے بیٹھے بی اے پاس کیا چونکہ مجھ کو وظیفہ ملا اس لئے شوق ہوا کہ ایم اے بھی کروں اس ارادے سے لکھنؤ آیا اور نام لکھا کر پوری محویت کے ساتھ مطالعے میں مشغول ہوگیا۔ میں اپنی اوباشی سے بھی عاجز آگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ خود فریبی سے ممکن ہے کہ میری ناآسودگی میں کچھ کمی ہوجائے گی۔ مگر میرا خیال غلط نکلا اور سرگردانی سے میری روح اور زیادہ محروم سکون ہوگئی بہرحال اب میرے مذاق میں ایک نیا تغیر ہوا میرا رجحان فلسفہ اور تنقید کی طرف ہوا اور آہستہ آہستہ یہ ذوق میرے اندر ایسا رچ گیا کہ مجھے خود اپنی فوقیت کا احساس ہونے لگا۔ میری ناقدانہ سنجیدگی مشہور ہوگئی میں نے اس زمانہ میں فلسفیانہ اور تنقیدی مضامین کثرت سے لکھے پروفیسر اور طلبار مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ لکھنؤ آئے ہوئے تقریباً آٹھ مہینے ہوئے تھے کہ میری زندگی میں ایک اور انقلاب پیدا ہوا جس نے مجھ کو وہ ناصری بنادیا جو میں اب ہوں۔ مرزا رفیع لکھنؤ کے

مشہور رئیس اور بیرسٹر ہیں۔ مغربی تعلیم و تربیت کئی پشت سے ان کے خاندان میں چلی آ رہی تھی، بالخصوص ان کے بھائی محمد شفیع بے انتہا آزاد اور روشن خیال تھے، وہ اپنی عورتوں کو بھی باہر نکالتے تھے، ان کی لڑکی طلعت اُسوقت بی۔ اے میں پڑھتی تھی، طلعت حُسن اور قابلیت کے لحاظ سے سارے لکھنؤ میں مشہور تھی۔ میں نے ابھی تک اُسکو دیکھا نہیں تھا۔ مرزا رفیع میرے باپ کے قدیم دوست تھے اور دلی دوست تھے، وہ اکثر آگرہ آیا کرتے تھے اور میرے ہی مکان پر ٹھہرتے تھے، میری بڑھتی ہی ہوئی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ میرے والد کی بے عنوان زندگی سے وہ کچھ خوش نہ تھے لیکن دوستی چونکہ پرانی تھی اسلئے حُسن اسلوب کے ساتھ نباہ رہے تھے۔ میں جب لکھنؤ آیا تو قصداً ان کی ملاقات سے پہلو بچاتا رہا لیکن ان سے ملاقات ہو گئی، وہ مجھ کو اپنے گھر لے گئے۔ واقعیات معلوم ہونے پر انھوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"تم نے بُرا کیا جو مجھے اب تک اسکی اطلاع نہ دی، اب تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے یہیں آ کر رہو اور پھر اطمینان کے ساتھ پڑھو تمھارے والد سے جتنی کارآمد صلاحیتیں اُن کے اندر تھیں اُن کو مٹا ہی ڈالا۔ نہ خود اپنی ذات کو کوئی فائدہ پہنچایا نہ کسی اور کو۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ تم کو بھی اپنا سا بنا کر رکھ دیں"۔

مجھے مرزا رفیع سے اس ہمدردی کی امید نہ تھی۔ میری ہمت نہ پڑی کہ ان کی خواہش کو رد کروں، مجبوراً اپنا سارا سامان لے کر اُن کے مکان میں چلا آیا۔

اس مکان میں مجھ کو ملا کر چار لڑکے تھے۔ ایک مرزا رفیع کا لڑکا شوکت جو انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ دوسرا اُن کی بہن کا لڑکا خورشید جو میرا ہمسن تھا اور بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ تیسری طلعت تھی۔ طلعت کو جب میں نے پہلی بار دیکھا ہے اسی وقت میرے سارے جسم میں ایک نئی روح دوڑ گئی۔ میں پہلی ہی نگاہ میں اس کی طرف مائل ہو گیا اور میرے قلب نے ایک نیا سُرور محسوس کیا جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی مگر جو مجھ کو آج تک میسر نہ ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے بہت جلد مانوس ہو گئے اس لئے کہ ہماری دلچسپیاں مشترک تھیں۔ اس کو بھی ادبیات کا ذوق تھا اور مجھ کو بھی انگریزی ادبیات میں کیٹس کی وہ بڑی دلدادہ تھی۔ اس جوان میر کی شاعری پر وہ اکثر مجھ سے بحث کیا کرتی تھی اور میری تنقید......... سُن سُن کر بہت خوش ہوتی تھی۔ وہ میری گرویدہ ہو چلی تھی۔ مجھ کو "علم کا دیوتا" کہا کرتی تھی۔ خورشید کو طلعت کی میرے ساتھ گرویدگی گوارا نہ تھی۔ وہ خود ہماری صحبتوں میں شریک ہونے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا ہم دونوں کو جب کبھی وہ ایک ساتھ دیکھتا تو بہت جلا کرتا۔ وہ طلعت کو حریفانہ

نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ طلعت کو اس کا احساس بھی نہ تھا۔ میں طلعت کی یہ روش دیکھ کر مطمئن تھا۔

طلعت کے ساتھ میری شیفتگی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ میں دل ہی دل میں اس کی پرستش کرنے لگا تھا۔ ظہیر! طلعت نے مجھ کو وہ چیز دی جس کے بغیر مجھے زندگی وبال تھی یعنی سکون و آسودگی۔ لیکن میں اپنے جذبات محبت کو علمی و ادبی موانست کے نقاب میں چھپائے ہوئے تھا۔ میں ایک دفعہ دھوکا کھا چکا تھا اور عہد کر چکا تھا کہ کسی عورت سے کبھی مغلوب نہ ہوں گا۔ آہ!

کہتے تھے دل نہ دینگے کسی کو تمام عمر
مجبور ہو گئے مگر اک دلستاں سے ہم

لیکن اب میں نے یہ قسم کھائی کہ اپنے دل کے راز کا اظہار کبھی نہیں کروں گا اور نہ اظہار کی کوئی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ میرا اعتقاد یہ تھا کہ اگر اپنے جذبات کو دل ہی میں پوشیدہ رکھ لیا جائے تو ان کی الوہیت بڑھ جاتی ہے۔ بہرحال میں نے طلعت کو اپنے دل کی حالت سے آگاہ نہیں کیا، حالانکہ اس کے ساتھ میرے شغف و انہماک کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی اتفاق سے چوبیس ۲۴ گھنٹے اس سے جدا رہتے گزر جاتے تو میرا دم گھٹنے لگتا تھا، میری اس خودداری اور ضبط نے مجھ کو تو کوئی نقصان نہیں

پہنچایا مگر آہ! طلعت کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔

ایک سال اس طرح گزر گیا کہ مجھ کو احساس بھی نہ ہوا، مجھ پر ہر وقت ایک بیخودی سی طاری رہنے لگی تھی۔ میری کلفتوں کی دنیا بہت پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا تھا کہ جس نامعلوم چیز کے لئے میری روح بیتاب رہا کرتی تھی وہ مجھ کو مل گئی ہے۔ طلعت مجھ کو واقعی بیحد چاہتی تھی۔ جب کبھی میں کسی سے ملنے چلا جاتا اور گھر دیر میں آتا تو وہ مجھ سے شکایت کرنے لگتی تھی۔ میری غیر حاضری میں اُس کے اوقات بڑی مشکل سے گزرا کرتے تھے۔ میں اس کی زندگی کا ایک "جُزوِ لازم" ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اس کو محسوس کرتا تھا۔ جو طلعت کا قیافہ اس شگفتگی کا اعتراف کر رہا تھا لیکن میں اپنے جذبات نیایش کا اظہار کرنے سے گریز ہی کرتا رہا۔ اظہار محبت کو میں غیر ضروری بھی سمجھتا تھا۔ کیونکہ اگرچہ میں بھی عشق کو شیفتہ کی طرح انسان کی "تہذیب نفس" کے لئے ضروری سمجھتا ہوں لیکن بقائے عشق کے لئے یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ مناکحت یا کسی دوسری رسمی زنجیر میں جکڑ کر خواہ مخواہ محبوب کو اپنی ملکیت بنا لیا جائے طلعت نے میری اس روش کو غلط سمجھا۔ اُس کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ میں اس کی محبت کی پذیرائی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اس طرح جڑ پکڑ گیا کہ وہ آزردہ و دلگیر رہنے لگی۔ میں اسکی دل گرفتگی کے

سبب سے مطلق آگاہ نہ تھا، طلعت کے چہرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی فکر میں گھل رہی ہے۔ کچھ دنوں تک تو وہ بدستور میرے ساتھ اٹھتی بیٹھتی رہی اور حسب معمول علمی و ادبی تذکروں میں دلچسپی کا اظہار کرتی رہی لیکن پھر روز بروز اس کو جو انہماک میرے ساتھ تھا اس میں بھی کمی ہونے لگی اور میری حیرت کی انتہا نہ تھی جب کہ میں نے دیکھا کہ خورشید سے آہستہ آہستہ مانوس ہو رہی ہے اور خورشید جس کو اب تک وہ قابل اعتنا بھی نہ سمجھتی تھی۔

میں یہ بتانا بھول گیا کہ اگرچہ طلعت کبھی خورشید کی طرف متوجہ نہ ہوتی اور اگرچہ شفیع صاحب نے خورشید کی ماں سے صاف کہہ دیا تھا کہ خورشید اور طلعت کا کوئی جوڑ نہیں ہے اور دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی تاہم خورشید اپنی چال سے بےخبر نہ رہتا تھا اس کو جب کبھی موقع ملتا تو وہ طلعت سے کچھ باتیں ضرور کر لیتا تھا۔ میں اس وقت نہیں جانتا تھا کہ وہ طلعت سے کیا کہا کرتا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ اپنی شیفتگی اور محبت جتایا کرتا تھا۔ ایک روز جب کہ گھر کے سب لوگ اکٹھا تھے طلعت کو مجھ سے معلوم ہو گیا کہ میری شادی ہو گئی ہے، اس دن سے اس کے برتاؤ میں نمایاں فرق ہو گیا۔ وہ مجھ سے کھنچتی گئی اور خورشید سے مانوس ہوتی گئی۔ میں نے سمجھا چلو یہ دوسرا دھوکا تھا، مگر طلعت کو اسی طرح پوجتا رہا، اس لئے کہ میں نے بلا کسی تحریک کے اسکو چاہنا شروع کیا تھا اور سچ پوچھو تو یہ میری پہلی محبت تھی۔

قصہ کو زیادہ طویل کرنا نہیں چاہتا۔ میں ایم اے پاس ہو گیا۔
طلعت بھی بی، اے میں اول آئی۔ گھر میں بڑی خوشیاں منائی جا رہی
تھیں مگر طلعت کے چہرے سے یاس و حرماں ہی ٹپک رہا تھا۔
میں نے اس سے کئی بار پوچھا کہ آخر اس غمگینی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟
مگر وہ ٹالتی رہی۔ تقریباً دو ماہ کے بعد ایک روز صبح کو معلوم ہوا کہ
طلعت کا کہیں پتہ نہیں اور اس کے ساتھ خورشید بھی غائب ہے۔ تمام
گھر میں ہلچل مچ گئی اس کا ذکر بیکار ہے لیکن میری حالت کا ہر شخص
اندازہ نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارا جسم مفلوج ہو گیا ہے۔ میں نے
چاہا کہ طلعت کو ایک مغلوب الاعصاب عورت سمجھ کر بھول
جاؤں مگر میری کوشش بیکار تھی۔ اسکی معیوب حرکت بھی میری نگاہ
میں اس کی منزلت کو گھٹا نہ سکی۔ آخر کار میں نے طلعت کے خیالی پیکر
سے اپنا دل بہلانا شروع کیا۔ دو تین مہینے بعد طلعت کا باپ کے نام خط آیا
جس سے معلوم ہوا کہ وہ خورشید کی بیوی ہو گئی ہے اور خورشید کو کوئی سرکاری
ملازمت مل گئی ہے۔ طلعت کے ساتھ مجھ کو سچی محبت تھی، اس کا اندازہ
اس سے کرو کہ اس وقت بھی میرے منہ سے طلعت کیلئے دعا نکلی۔
اب لکھنؤ میں میرے لئے کوئی دلبستگی نہ تھی۔ میں نے لکھنؤ چھوڑ دیا
اور کلکتہ میں جا کر ایک انگریزی اخبار کی ایڈیٹری کر لی۔ اب میرا میلان

سیاسی زندگی کی طرف ہوا۔ پھر کہاں کہاں کی خاک چھانی، قید فرنگ کی بھی سیر کر آیا۔ طلعت کی محبت نے مجھ کو کیا نہیں دیا۔ سب سے بڑی دولت جو اس نے دی وہ روحانیت تھی جس نے مجھ کو زندگی کے راز سے آگاہ کر دیا۔ مجھ کو معلوم ہو گیا کہ اطمینان دراصل کس کو کہتے ہیں اور اس کو کیوں کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میرا عقیدہ اب یہ ہے کہ اک محبت ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو ابدیت کی چاشنی سے آگاہ کر کے اس کے قلب کو سکون و اطمینان سے معمور کر سکتی ہے۔

تین سال کے بعد مجھ کو خبر ملی کہ خورشید نے اپنی ہوس پوری کر کے طلعت کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا کہ وہ لکھنؤ واپس آئی ہے مگر اپنے والدین کے ساتھ نہیں ہے بلکہ لڑکیوں کے کالج میں پروفیسر ہے اور علیحدہ مکان لیکر رہتی ہے۔ یہ سن کر میں کلکتہ سے فوراً اس سے ملنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب جس طرح ہوگا طلعت سے اپنے دل کی کیفیت بیان کر کے اس کو اپنا بنا لوں گا، طلعت نے پہلے تو مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا مگر میں نے کہا۔ "میں عمر بھر اسی در پر کھڑا رہوں گا اور بلا ملے ہوئے نہ جاؤں گا"

وہ مجھ سے ملی۔ ظہیر میں نے آج بھی اس کو اتنا ہی معصوم پایا جتنا کہ وہ اپنی افتادگی اور پستی سے پہلے تھی۔ میں ہمیشہ محسوس کیا کرتا تھا کہ اسکی

آنکھیں فضا کو معصومیت سے معمور کر رہی ہیں اور آج بھی وہ اپنی نگاہوں سے گرد و پیش کی چیزوں کو اسی طرح منزہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کچھ دیر تک تو طلعت نظر نیچی کئے ہوئے خاموش بیٹھی رہی لیکن جب دیکھا کہ میں سکوت میں ہوں تو دبی زبان سے پوچھا۔ "کہیئے آپ کس غرض سے آئے ہیں؟ آپ کو اب مجھ سے کیا سروکار ہو سکتا ہے؟"

میں اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ میں کچھ گھبرا گیا مگر پھر اپنی طبیعت کو سنبھال کر جواب دیا:۔

طلعت مجھ کو جو سروکار تم سے ہمیشہ تھا وہ اب بھی ہے۔ میں تم کو ہمیشہ چاہتا رہا۔ نہیں بلکہ پوجتا رہا ہوں اب میں اس غرض سے آیا ہوں کہ تم کو اپنی پناہ میں لیلوں جس کی تم سخت ضرورت ہے"۔

طلعت نے طنز سے کہا۔ "آپ نے اس وقت مجھ کو پناہ میں لینے کا ارادہ کیا ہے جب کہ دراصل نہ مجھ کو پناہ کی ضرورت ہے اور نہ میں کسی کی پناہ کی مستحق ہوں۔ کیوں ناصری صاحب آخر آپ نے اسوقت اسی سادگی اور خلوص کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیوں نہ کر دیا تھا جب کہ میں آپ کی زبان سے ایک حرف اس قسم کا سننے کے لئے ترپ رہی تھی۔ مجھے تو اس کا پورا علم ہے مگر آج آپ کو بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ میں فی الحقیقت خورشید کی نہیں بلکہ آپ کی مشاقی ہوئی ہوں جبتک میں نے

آپ کو نہیں دیکھا تھا، آپ کی ساحرانہ گفتگو نہیں سُنی تھی، جب تک محبت اور اس کے اثرات سے یک قلم بیگانہ تھی۔ خورشید مجھ سے برابر اظہار تعشق کیا کرتا تھا مگر اس کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ یہ سب جادو آپ نے آکر چلایا۔ آپ نے میرے اندر ایک طلب، ایک خلش تمنا پیدا کر دی جس کو آپ آسودہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ میں نے بہت چاہا کہ آپ کے جذبات کو اُبھاروں لیکن میری کوشش کارگر نہ ہوئی یہاں تک کہ مجھ کو یقین ہو گیا کہ آپ محض ایک منطقی جانور ہیں اور زیادہ سے زیادہ آپ کا احترام کیا جا سکتا ہے آپ محبت کی چیز نہیں۔ خورشید برابر مجھ سے اپنی محبت جتا رہا تھا۔ اسی دوران میں مجھ کو معلوم ہو گیا کہ آپ کی شادی ہو چکی۔ میری رہی سہی امید بھی منقطع ہو گئی۔ ادھر میں نے دیکھا کہ جو آگ آپ نے میرے اندر بھڑکائی ہے اُس کو خورشید بجھانے کے لئے تیار ہے۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔"

طلعت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میری رگوں میں خود ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میں ضبط نہ کر سکا اور بیتابانہ طلعت کو لپٹا کر کہا۔

"تو کیا ہماری محبت بلا ازدواج بلا کسی قسم کی آلودگی کے قائم نہ رہ سکتی تھی؟ محبت کا تعلق تو روح سے ہے اس کو مادی علائق سے کیا نسبت؟

طلعت نے ایک تلخ مسکراہٹ سے کہا "عورت ایسی محبت نہیں کیا کرتی، یہ مرد ہی کا کام ہے کہ محبت کو روحانیت، تصوف، فلسفہ شاعری اور تمام دنیا کے خرافات کے رنگ میں رنگ کر اپنے گوں کی چیز بنالے۔ مرد میں عقل کی زیادتی ہوتی ہے اس لئے اس کی محبت بھی معقول ہوتی ہے۔ عورت میں وجدانیت کا عنصر غالب ہے، وہ محبت کو محبت سمجھتی ہے اور محبت نام ہے دو ہستیوں کے ہر لحاظ سے ایک ہو جانے کا۔ میں خود آپ کی ہونا چاہتی تھی اور آپ کو اپنا بنانا چاہتی تھی"۔

میں نے مجرمانہ لہجے میں کہا "تو یہ اب بھی ہوسکتا ہے پچھلی باتوں کو بھول جاؤ تو تلافی مافات ہو جائے"۔

طلعت نے کہا "اس کے جواب میں آپ کا یہ مصرع ہے ؎

دوش ما من دیر نشیں لائق زنار نماند

ناصری صاحب اب میں آپ کے لائق نہیں"۔

یہ کہہ کر اس نے میری پیشانی پر ایک بوسہ دیا اور پھر کہا "اب آپ پھر مجھ سے نہ ملئے گا۔ جائیے جس طرح آپ ہر چیز کو مایا سمجھتے رہے اسی طرح محبت کو بھی مایا سمجھئے لیکن میری آخری خواہش یہ ہے کہ آپ اپنی بیوی کو جس کا دل آپ اتنے دنوں سے دکھاتے رہے ہیں اب زیادہ پریشان نہ کیجئے، اس کو اپنے ساتھ لے جائیے اور رفیقانہ ایک دوسرے کے

ساتھ زندگی بسر کیجئے"

میں اُس بوسے کی لذّت کبھی نہیں بھولوں گا جس نے مجھ کو غیر فانی بنا دیا ہے طلعت نے مجھ کو فوراً رخصت کر دیا۔ دوسرے دن سارے لکھنؤ میں یہ خبر اُڑ گئی کہ طلعت نے خودکشی کر لی، میرے دماغ میں پھر انتشار شروع ہوا جس کی بنا پر تین سال اور خاک بسر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا مگر پھر مجھ کو طلعت کی وصیت یاد آئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میرے دل و دماغ میں کچھ یوں بھی انقلاب پیدا ہو گیا تھا میری بغاوت اور سرکشی میں وہ جوش نہ تھا۔ میں آگرہ گیا اور بیوی کو لیکر چلا آیا اُس وقت سے آج تک نہ میں پھر کبھی آگرہ گیا ہوں اور نہ اپنے عزیزوں کی کبھی صورت دیکھی۔ میری بیوی کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی، میری بے توجہی نے تو اُس کا دل چھلنی کر ہی ڈالا تھا۔ اس پر میرے گھر والوں کی بے توجہی نے اور بھی اسکو تباہ کر ڈالا۔ ہندوستان بھی عجیب جگہ ہے جہاں عورت اپنا کوئی ذاتی وجود نہیں رکھتی۔ جب تک شوہر اسکی دلجوئی کرتا ہے تب تک سب ہی دلجوئی پر آمادہ رہتے ہیں۔ شوہر کے منحرف ہوتے ہی ساری دنیا بیچاری سے برگشتہ ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ میری بیوی نے مشکل سے تین سال گزارے ہوں گے کہ اس کو موت کے گھاٹ اُترنا پڑا۔ یہ میری عمر کا پینتیسواں سال تھا۔ اب دنیا میں میں یکہ و تنہا تھا۔ ہر طرح کی زندگی سے

اُکتا گیا تو یہاں آ کر پروفیسری کر لی۔ اس لئے کہ اس سے بڑھ کر امن وامان کی زندگی ممکن نہ تھی۔ میں نے لکھنا پڑھنا بالکل بند کر دیا ہے۔ اس لئے کہ اب میرے واردات قلب تحریر میں نہیں لائے جا سکتے۔

میں نے محبت کی اور اس کو کھو بھی چکا ہوں مگر محبت کی لذّت اب تک مجھ کو مل رہی ہے۔ ظہیر! کیا تم یقین کرو گے اگر میں کہوں کہ میں ستاروں کی چمک میں، آفتاب کی تابش میں، چاند کی صباحت میں، صبح کے کافوری نور میں، شام کی شفق میں، غرض کہ ساری کائنات میں طلعت ہی کے جلوے دیکھتا ہوں۔ میں ہر لمحہ اُس کو اپنے سے قریب پاتا ہوں تم اس کو طلعت کی یاد کہو گے، میں اس کو طلعت سمجھتا ہوں"۔

ناصری نے اپنی عبرتناک داستان ختم کر دی اور ایک ٹھنڈی سانس لیکر مجھ سے کہا۔ "بس جاؤ تمھاری دیرینہ آرزو بھی پوری ہو گئی۔ میری طبیعت کا ایک بوجھ بھی ہلکا ہو گیا"۔

ناصری تھک گیا تھا۔ اس لئے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پلنگ پر لیٹ کر سو گیا۔

(۵)

ناصری کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جاتی تھی۔ ڈاکٹر باویس ہڈ نے

لگے وہ زیادہ تر غفلت کے عالم میں پڑا رہتا تھا۔ اکثر خواب میں طلعت! طلعت! پکارا کرتا تھا۔ مجھے اس کی صورت دیکھ کر رونا آتا تھا میں سوچتا کہ یا خدا یہ بھی کیسے ظرف کا انسان ہے اتنی مدت تک ایسے ہنگامے کو اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا اور دیکھنے والوں کو اپنے ظاہری سکون سے دھوکے میں ڈالے ہوئے تھا۔ پورے ایک سال اور تین مہینے بیماری کی سختیاں جھیل کر ناصری نے اس گنج محنت آباد سے رحلت کی اور اپنی طلعت سے جا ملا اسوقت اسکی عمر اکتالیس سال کی تھی۔

"شد ختم بہ خاموشی افسانہ چنیں بایہ"

اپنی داستان بیان کر کے اس نے مجھ کو بھی سکون و آسودگی کے راز سے آگاہ کر دیا۔ سکون کبھی خارجی اسباب سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ خود اپنا پیدا کیا ہوتا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ان نامساعد واقعات سے بھی سکون حاصل کر سکتے ہیں جو عموماً باعث آشفتگی بتائے جاتے ہیں۔ اگر انسان میں صلاحیت ہو تو اس کو گرداب میں وہ راحت مل جائے جو ساحل نشینوں کو کبھی خواب میں نہ میسر ہو۔

۲۸ء۱۹

محبت کی قربانیاں

(۱)

آہستہ بولو شمیم آہستہ۔ نہ جانے کیوں جب تم جوش کے ساتھ باتیں کرتے ہو تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تمہارا یہ سارا مجذوبانہ خروش میری محبت کا کرشمہ ہے مگر اب میں سمجھتی ہوں کہ تمہاری فطرت ہی ایسی ہے۔ مجھے چاہتے یا نہ چاہتے۔ کسی عورت نے تم کو دیوانہ بنایا ہوتا، یا نہ بنایا ہوتا۔ تمہارے جوش و خروش کا یہی عالم ہوتا۔ تمہاری طبیعت ہی ہیجان ہے۔ تمہاری رگ رگ بلا وجہ پھڑکا کرتی ہے ہیجان و انتشار تمہارے خمیر میں ہے۔ ورنہ آج جب کہ تم اپنے کو محبت میں کامیاب بنا سکتے ہو، جب کہ میں وفا کا عہد تمہارے ساتھ باندھ چکی ہوں اور تمہاری ہو چکی ہوں۔ تم مجھے اس طرح چھوڑ کر سارے جہان کی خاک چھاننے پر نہ آمادہ ہو جاتے، محبت کی آسودگیاں تم کو نصیب ہیں اور تم محبت سے آنکھیں پھیر کر دنیا کے جھگڑوں میں کھو جانا چاہتے ہو۔ خدا کا شکر ہے محبت تمہارے حق میں دکھ نہیں ثابت ہوئی لیکن تم نے تو خود

اپنے لئے ایک نیا دُکھ مول لیا ہے۔ آخر تم کو ملک و قوم کی کیا ایسی پڑی ہے
جو سارے عیش و عشرت سے منھ موڑ کر بھاڑ میں کودنے کی ٹھان لی ہے
تم قوم و ملک کا ایک اپنی جان ہلکان کر کے کیا بھلا کر لو گے اور ملک و قوم
تم کو کیا بھر دیں گے اور پھر مجھے کس سہارے چھوڑے جا رہے ہو اگر تم کو
دربدر کی ٹھوکریں کھانا پسند ہے تو مجھے بھی ساتھ لے چلو، میں تنہا اب جینے
میں کوئی لذت نہ پاؤں گی۔ کیا تم کو اس کا بھی پاس نہیں کہ میں نے اپنا دھرم
اور سارا کنبہ تج کر تم سے شادی کر لینے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے اپنا بتلا کر کے
اور مجھ سے محبت کا معاہدہ لیکر اتنی جلد مجھ سے سیر ہو گئے۔ اس دن کی مجھے
خبر نہ تھی"۔

کملاوتی کا دم رُکنے لگا اور اب وہ آنسو بہا رہی تھی۔

شمیم جواب تک کملاوتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اس کو دم بخود
دیکھ رہا تھا اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹہلنے لگا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی
زبردست آزمائش میں مبتلا ہے جس میں اسکی روح کو اذیت ہے۔ ٹہلتے ٹہلتے
وہ کملاوتی کے پاس آیا۔ اس کا سر اوپر اٹھا کر اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیکر
کہنے لگا۔ "کملاوتی تم میرے خروش سے گھبراتی ہو اور میں تمہارے۔ حیرت ہے
کہ تمہارے اندر یہ طوفان کس نے بھر دیا۔ میں تو خیر سودائی ہوں۔ مجذوب ہوں،
باؤلا ہوں، مگر تم میں یہ مجنونانہ ہنگامہ خیز جذبات کہاں سے آیا۔ کملاوتی

تمھیں کیسے سمجھاؤں کہ اگر انسان صرف اپنے لئے جیا تو اس کو انسان نہ کہنا چاہیئے۔ اس طرح تو گائے بیل بھی جی لیتے ہیں، انسان کے دل میں ابنائے جنس کا درد ہونا چاہیئے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کو ظلم و جور کے ہاتھوں غارت ہونے سے بچائے۔ چاہے اس میں خود اسکی جان چلی جائے۔ میں تم کو اپنا دل چیر کر کیسے دکھادوں، ملک میں عدل و مساوات، انسانیت اور آزادی کے لئے جو شورش پھیلی ہوئی ہے اس سے الگ رہنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ میں اپنا خون بہا دینا چاہتا ہوں اگر یہ بہا ہوا خون برادران ملک کے کام آسکے۔ میں تڑپ رہا ہوں کہ کس طرح اپنا گلا کٹا کر استبداد سے یاران وطن کی گلو خلاصی کراؤں۔ کملاوتی وہ زمانہ کچھ بہت دور نہیں جبکہ میری مراد بر آئے اور ملک میں آزادی اور حرّیت کا ڈنکا بجنے لگے لیکن میری پیاری کملاوتی! تم سے یہ کس نے کہا کہ میں تم سے سیر ہو گیا ہوں۔ یا اب مجھے تمھاری محبت نہیں رہی۔ میں خدا اور اسکی مخلوق کی راہ میں کام آنے جا رہا ہوں کیا اس کے یہ معنی ہوئے کہ مجھ کو تم سے محبت نہیں رہی؟ یہ اچھی منطق ہے۔ کملاوتی تم بی۔ اے ہو، روشن خیال ہو، تہذیب و تمدن کے رموز کو جانتی ہو۔ پھر یہ کیا بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو؟ میں قسم کھا کر یہ دعوے کرنے کے لئے تیار ہوں کہ مجھ کو تم سے روز بروز نہیں لمحہ بہ لمحہ محبت بڑھتی جاتی ہے اور مجھے تمھاری محبت پر اعتماد ہے کہ وہ میرے قومی جوش کو بھی

کبھی دبنے نہ دونگی، میں تم کو یاد کر کے اور تمہارا نام لیکر وطن کی خدمت کرونگا اور اسمیں مجھے بڑی لذت ملیگی۔ تم ہراساں نہ ہو، میں تم سے کچھ ہمیشہ کے لئے نہیں بچھڑ رہا ہوں۔ سال دو سال کی بات ہے، پھر اس سیاسی داو وپیچ کا کچھ نہ کچھ فیصلہ ہو جائے گا اور میں تم سے آملوں گا، پھر میری دنیا کا مرکز تنہا تم ہوگی اور میری تمام راحتیں تم سے وابستہ ہوں گی، اس وقت مجھ پر اور مطالبات ہیں۔ میری اچھی کملاوتی مجھے نہ روکو۔ ہنسی خوشی مجھے اجازت دو کہ اس سیاسی اکھاڑے میں جاکر کچھ کام کر آؤں''۔

''ہاں اب تم کو نام ونمود کا سودا ہوا ہے۔ یہ بات تم میں پہلے تو نہ تھی۔ آج تم دو سال سے میری محبت کا دم بھر رہے ہو لیکن گزشتہ پانچ چھ ماہ سے تم کچھ بدل سے گئے ہو اور مجھ سے کچھ سرد مہری برتنے لگے ہو خیر جہاں جاؤ خوش رہو۔ میرا بھی خدا مالک ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ محبت مرد کی ہستی کا صرف ایک جزو ہے مگر عورت کی ساری ہستی ہی محبت ہے۔ یہ ہے مجھ میں اور تم میں فرق''۔ کملاوتی کی آنکھوں میں اب بھی آنسو چمک رہے تھے۔

یہ سُن کر شمیم بیچین ہوگیا اور کسی قدر ترشرو ہو کر بولا'' کملاوتی! کس جرم کی سزا ہے میرے دل میں یہ نشتر توڑے جا رہے ہیں۔ طنز کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے۔ اب اس سے آگے میں ہرگز تم سے اس لہجہ میں بات سُننے کے لئے تیار نہیں ہوں''۔

کملاوتی سب کچھ گوارا کر سکتی تھی مگر شمیم کی خفگی ایک لمحہ کے لئے بھی ناگوار تھی۔ اس نے فوراً اپنا لہجہ بدل دیا اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے شمیم کو لپٹا کر کہا:۔

"میرے دل کے مالک مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، میرے ساتھ رہو یا مجھے اپنے ساتھ لے چلو"۔

شمیم کا دل بھر آیا۔ اب اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ کملاوتی کی التجاؤں کا مقابلہ کرتا۔ ناچار اس کو کہنا پڑا "اچھا کملاوتی جیتی، میں ہارا، رو رو کر للہ اپنا حال تباہ نہ کرو۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں مروں گا، یہیں دفن ہوں گا۔ بس اب خوش ہو جاؤ اور ہنس دو"۔

کملاوتی پھول کی طرح کھل گئی اور شمیم کو خوب پیار کیا۔ شمیم نے بھی پیار کا جواب پیار سے دیا۔ مگر اس کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اس کا چہرہ دھندلا تھا اور وہ متفکر معلوم ہوتا تھا۔

مطلع دیر سے غبار آلود تھا، اب شام ہو گئی تھی اور ہر طرف گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے تھے، کملاوتی کو کچھ ہوش نہ تھا لیکن شمیم ایسا بےخبر نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا:۔

"کملاوتی اندھیری رات ہے، برسات کا موسم ہے، دور جانا ہے اب چلنا چاہیئے۔ تفرقہ انداز زمانہ سے خدا سمجھے جو دو گھڑی بھی ہم کو

یکجا نہیں دیکھ سکتا"۔ دونوں محبت کے مارے ہاتھ میں ہاتھ دئے سکندر باغ سے اُٹھے اور گھر کا راستہ لیا۔

(۲)

دو دن ہو گئے کملاوتی نے شمیم کو نہیں دیکھا۔ ایک ہفتہ گزرا، دو ہفتے گزرے اور شمیم کی خبر نہیں۔ بڑی مشکل سے معلوم ہو سکا کہ شمیم لکھنؤ میں نہیں ہے۔ کملاوتی کو خفقان سا ہونے لگا۔ طرح طرح کے وہم دل میں آتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کملاوتی کی جان شمیم میں بسی تھی تو مبالغہ نہ ہوگا، اس نے شمیم کو چاہا اور دل، جان، عقل، ایمان سب کچھ نچھاور کر کے چاہا، وہ ایک سربرآوردہ ہندو خاندان کی لڑکی تھی اور اسی سال بی، اے میں اعزاز کے ساتھ پاس ہوئی تھی۔ نک سک سے درست، مزاج میں صوفیانہ سادگی، تعلیم و تربیت کی دولت سے مالا مال، ایک عورت میں اور کیا ہونا چاہیئے۔ کملاوتی لکھنؤ کی سرسوتی تھی۔ نہ جانے کتنے دلوں میں اس کا درد تھا اور نہ جانے کتنے سروں میں اس کا سودا، شمیم بھی کملاوتی کے پرستاروں میں سے تھا لیکن وہ اپنی محبت میں نامراد نہ تھا اسکی محبت کے بدلہ میں کملاوتی کی طرف سے بھی محبت تھی جب کملاوتی ایف، اے میں تھی اور شمیم بی۔ اے میں۔ اسی وقت سے یہ باہمی محبت چلی آ رہی تھی، جس کا چرچا اکثر لوگوں کی زبان پر تھا، کملاوتی نے

شمیم کے دشمنوں کی تعداد میں خاصہ اضافہ کر دیا تھا۔ نہ جانے کتنے تھے جو کملاوتی کی ہوس میں اپنا سارا سرمایۂ حیات لٹا دینے کے لئے تیار تھے، مگر کملاوتی نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں، نہ جانے شمیم کی وہ کون سی ادا تھی جو اس کے دل میں گھر کر کے رہ گئی، اب شمیم تھا اور کملاوتی۔ کملاوتی کے لئے شمیم اور زندگی دو مترادف الفاظ تھے۔ شمیم سے جدا ہو کر زندگی کا مفہوم اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا اور آج اسی شمیم سے وہ ایک نامعلوم مدت کے لئے جدا ہو گئی تھی۔

وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں

جبر کیوں کر یہ اختیار کریں

شمیم کے سر میں سیاسیات کا سودا کوئی نیا سودا نہ تھا، اس کے اندر وطن پرستی اور قومیت کا جذبہ بچپن سے موجود تھا، چنانچہ جب ملک میں عدم تعاون اور سودیشی تحریک شروع ہوئی تو شمیم نے اپنے ہمچشموں میں سب سے پہلے کھدر زیب تن کیا۔ بعض اس پر روئے اور بعض ہنسے، لیکن شمیم نے لوگوں کی اس قومی بے غیرتی کی پروا نہ کی کملاوتی شمیم کی طبیعت کے اس رنگ کو خوب جانتی تھی اور اسکی قدر کرتی تھی، خود اس کے اندر حبِ قومی کچھ کم نہ تھی۔ شمیم کے ساتھ ساتھ اس نے بھی کھدر پہننا شروع کیا تھا، جانبازان قوم کی سرگزشت

اخباروں میں پڑھ کر اس کے دل میں ایک لہر اُٹھنے لگتی تھی۔ وہ اکثر شمیم سے سیاسیات ہند پر تبادلۂ خیالات کیا کرتی تھی اور یہ دیکھ کر خوش ہوتی تھی کہ اسکے چاہنے والے کو ہندوستان کی نازک حالت کیساتھ اتنی ہمدردی ہے لیکن جب اس کی نوبت آئی کہ شمیم اپنی ہمدردی کو عملی جامہ پہنائے تو کملاوتی کے قدم لڑکھڑا گئے، وہ شمیم کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی شمیم کے علاوہ اور لوگ ہیں جن کو خطرات کا مقابلہ کرنا چاہیئے جن کو ہندوستان کے لئے مال و جان کا خسارہ اُٹھانا چاہیئے مگر شمیم ہرگز اس قابل نہیں۔ یہ تھی کملاوتی کی محبت اور یہ تھا اسکا استدلال شمیم تلا ہوا تھا کہ وہ سر کے بل جا کر اس سیاسی امتحان گاہ میں شریک ہو جائے۔ کملاوتی نے اس کا دامن پکڑ لیا اور اس کے آنسوؤں کی سیتا گرہ نے شمیم کو یہ وعدہ کرنے پر مجبور کیا کہ وہ اپنے ارادہ سے باز رہے گا۔

لیکن شمیم پر اب جو نشہ چڑھا تھا اس کا اُترنا آسان نہ تھا، کملاوتی سے رخصت ہوتے ہی اس کے دل و دماغ میں پھر وہی کشمکش پیدا ہوئی اب وہ نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر کملاوتی کے خیال کو اپنے دل سے دور کرنا چاہتا تھا اور اس کی بہترین صورت یہ تھی کہ اس وقت ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جو حشر برپا تھا اس میں اپنے آپ کو کھو دے۔ کملاوتی اسکے راستے میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی اب شمیم نے

یہ طے کیا کہ کملاوتی کو بغیر خبردار کیئے ہوئے کسی دوسرے شہر میں چلا جائے اور دل کھول کر اس عالمگیر شورش میں حصہ لے۔ اس نے یہی کیا اور ایک دن چپکے سے لکھنؤ چھوڑ کر کہیں نکل گیا، نہ کسی دوست کو علم تھا اور نہ کسی عزیز کو کہ شمیم کہاں گیا۔

محبت کا سب سے زبردست فریب یہ ہے کہ محبت کرنے والے اس کو پائدار سمجھتے ہیں۔ شمیم اور کملاوتی دونوں کو یقین تھا کہ ان کی محبت کبھی مٹ نہیں سکتی۔ شمیم کا یہ دھوکا تو بہت جلد دور ہو گیا لیکن کملاوتی اب تک وہی خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ شمیم واپس آئے گا اور جلد واپس آئے گا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ شمیم کے لئے بنی ہے اور شمیم اس کے لئے۔ اسی لئے وہ اہل خاندان سے بغاوت کرنے پر تل گئی تھی اور شمیم کے ساتھ عمر بھر کے لئے پیمان رفاقت باندھنے کا عزم مصمم کر چکی تھی۔ شمیم اس سے منھ موڑ کر چلا گیا تھا۔ کملاوتی کو اس کا ملال تھا لیکن اسکو اب بھی اپنی قسمت کا مستقبل خوش آئند نظر آرہا تھا۔

کملاوتی کا جی سن سے ہو گیا جب اس نے ایک دن کسی اخبار میں پڑھا کہ شمیم لاہور میں سودائیان حریت کا سرغنہ بنا ہوا ہے اور اپنی دھواں دھار تقریروں اور تحریروں سے اپنی دوادوش سے دور دور تک آگ لگائے ہوئے ہے۔ اس نے کالجوں کا قلع قمع کرنے کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔

اور سرگرمی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ نوجوانوں کا طبقہ خصوصیت کے ساتھ شمیم کی ساحرانہ شخصیت سے مبہوت ہو رہا ہے۔ لاہور میں ایسے نونہالوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جو وطن کے لئے اپنے کو قربان کر دینے پر خلوص نیت کے ساتھ آمادہ ہیں۔"

کملاوتی نے یہ پڑھا اور دیر تک سکتہ کے عالم میں رہی۔ اسکی اُمیدوں کا طلسم پل مارتے ٹوٹ گیا تھا اور وہ اس دھکے کو برداشت نہ کر سکی، اب وہ اپنی دنیا میں ایک تاریک خلا پا رہی تھی جس کو کوئی بھر نہ سکتا تھا۔ شمیم نے دغا تو نہیں کی لیکن اس کی زندگی کو بیگانہ اصلیت ضرور کر دیا۔

دو ہی چار روز بعد کملاوتی کو ایک لفافہ ڈاک سے ملا۔ انداز تحریر شمیم کا تھا۔ کملاوتی نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

پیاری کملاوتی!

میں یہ خط کچھ اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ تم مجھے بے قصور سمجھ کر معاف کر دو۔ تم اگر مجھ کو قصوروار سمجھتی ہو تو میں قصوروار ہوں اور تم میرا قصور ہرگز معاف نہ کرو، میں یہی چاہتا ہوں، تمہارے حق میں بھی بہتر ہے۔ بہرحال تم کو چند واقعات سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں جن کو اب تک تم سے چھپائے ہوئے تھا، میں آج بھی یہ کہنے کا

منہ کھتا ہوں کہ میں نے اگر چاہا تو کملاوتی کو۔ کملاوتی نے میری زندگی کو جن کیفیتوں سے معمور کر دیا مشکل سے کوئی دوسرا کر سکتا ہے اس کا اثر میری اس خاک بسر زندگی میں بھی نمایاں ہے۔ جس خلوص اور انہماک کے ساتھ میں ملک کے لئے لڑ رہا ہوں وہ تمہارا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر میں اس لڑائی میں اپنا سر کٹانے کے لئے تیار ہوں تو صرف اس لئے کہ تم نے میرے اندر سرفروشی کا ایک جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ مختصر یہ کہ اسوقت جو کچھ میں ہوں وہ تمہارا اور تمہاری محبت کا بنایا ہوا ہوں۔

کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

اب یہ سنو کہ میں نے تم کو چھوڑ کیوں دیا؟ میں تمہارے "ایمان محبت" کا دل سے قائل ہوں۔ تم وفا کی دُھن میں بڑی پختہ ہو۔ میں اپنے کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا کہ کملاوتی جیسی وفاکیش عورت نے میری رفیق زندگی بننے کا وعدہ کیا ہے اور اس دولت کو حاصل کرنے کے لئے اگر مجھے کونین کی دولت لُٹا دینا پڑتی تو مجھے اس کی پروا نہ ہوتی، اس دنیا میں محبت کو اتنی قدرت کہاں؟ یہاں تو کفر و اسلام کا سکّہ چلتا ہے۔ تم ہندو میں مسلمان، اور محبت جیسی پاک چیز بھی اس تفریق کو شاید نہیں مٹا سکتی۔ آہ!

دنیا کو معلوم نہیں کہ

عاشق ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر ندا ند

یہی دیر و حرم کا جھگڑا میرے اور تمہارے درمیان آکر حائل ہوا
تم نے سارے زمانے سے مخالفت کرکے میرے ساتھ شادی
کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ تمہارے گھر والے جانتے تھے کہ تم کیا
کرنے والی ہو۔ انھوں نے مجھے باز رکھنے کی کئی تدبیریں کیں
لیکن میں بھی اپنے جنون میں کچھ کم پختہ مغز نہ تھا اور میں مرتے
دم تک تم سے الگ نہ ہوتا، اگر ایک دن تمہارا بھائی سوریش
اس عفریت کے ساتھ جس کو تمہارے ماں باپ تمہارے لئے
بہترین شوہر سمجھتے ہیں۔ آکر مجھ سے صاف صاف یہ نہ کہتا۔
"شمیم صاحب یہ سمجھ لیجئے کہ کملاوتی کو ہرگز اس کا موقع نہیں
دیا جائے گا کہ وہ اپنی آرزوئے خام کو عمل میں لائے۔ اگر آپ نے
جلد سے جلد اس سے کنارہ کش ہونے کی کوئی سبیل نہ نکالی تو
ہم آپ کو آگاہ کئے دیتے ہیں کہ کملاوتی کا خون آپ کی گردن پر
ہوگا۔ کملاوتی کو زہر دے کر سارے جھگڑے بڑی سہولیت سے
چکا دئے جائیں گے مگر آپ لوگوں کو شادکام نہیں ہونے دیا جائیگا۔

اگر ایک مچھلی سارا جل گندہ کر رہی ہے تو اس کا قصہ تمام کر دینا کار ثواب ہے۔ کملاوتی ننگ خاندان ہے اس کا گلا گھونٹ دینا ہمارے لئے ملال کا سبب ہو تو ہو مگر کوئی مشکل یا دور از کار بات نہ ہوگی۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔"

کملاوتی۔ مجھے سریش کی دھمکی کی تو پروا نہ تھی مگر اس بہیمیت کے دیو گرجا کی صورت دیکھ کر میرے رونگٹے تھرّا گئے۔ وہ مسکرا رہا تھا، اس کی مسکراہٹ اس کی بدنیتی کا آئینہ تھی، وہ نشۂ انتقام میں سرشار تھا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ سوریش کی دھمکی کو سچ کر دکھاتا، اسی دن سے میں نے یہ ٹھان لیا کہ اپنے دل اور اپنی روح پر جو کچھ گزر جائے مگر تمہاری ہلاکت کا سبب ہرگز نہیں بنوں گا۔ میں نے تم سے اس کا ذکر کرنا بیکار سمجھا۔ مگر یہ غم اندر ہی اندر میرے قلب و جگر کو مفلوج کر رہا تھا۔ تم اکثر میری سرد مہری کی شکایت کیا کرتی تھیں، آج تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ وہ سرد مہری کہاں سے آئی تھی، اگر تم کو نشیب و فراز سمجھا کر تم سے کہتا کہ تم مجھے چھوڑ دو۔ تو بھلا تم سے اس کی کب امید تھی۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ بہتر کیا۔ مجبوری کا نام صبر ہے۔ کیا کروگی؟

از رسم جہاں گذشت نتواں
وز راہ زمانہ گشت نتواں

مجھے بھول جاؤ اور کامیاب زندگی بسر کرنے کی کوشش کرو
میں خود بھی کرنے والا ہوں۔ ہفتہ عشرہ کے اندر ایک نادار اور
بے یار و مددگار لڑکی سے میں بھی شادی کرنے والا ہوں۔ تو سُنا۔
اب اگر تم میرا پیچھا کرو بھی تو بے سود ہے مجھے خط بھی نہ لکھنا۔
اس لئے کہ اب تو میں وطن کی راہ میں خانہ بدوش ہو کر نکلا ہوں
نہ جانے کہاں کہاں کی خاک اُڑاتا پھروں گا اور تمہارے خط نہ
جانے کس کے ہاتھ لگیں۔ کملا وتی خیریت یہ ہے کہ سیاسی زندگی
بھی بڑی محویت اور خود فراموشی کی زندگی ہوتی ہے، اپنے درد کو
بھولنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ سارے زمانہ کا درد دل میں
لیکر بیٹھ رہو۔ آج اگر میں کانگریس کی شورش میں نہ منہمک ہو جاتا
تو تم سے جدا ہو کر سانس لینا دشوار ہوتا مگر جب میں دیکھتا ہوں
اور سوچتا ہوں کہ ہندوستان کی تیس کروڑ آبادی میں زیادہ تعداد
ان لوگوں کی ہے جو طرح طرح کی محنت و ابتلا میں گرفتار ہیں اور
حرف شکایت مشکل سے زبان پر لاتے ہیں تو میں اپنی ذات
سے شرمندہ ہوتا ہوں، مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنی قسمت کا رونا

روؤں۔ اللہ اللہ کتنے ہیں جن کو دو وقت پیٹ بھر کے روٹیاں نہیں نصیب ہوتیں، کتنے ہیں جن کو کج رفتار زمانہ نے عمر بھر اتنی مقدرت نہ دی کہ وہ کمر سے اوپر اپنے جسم کو ڈھانپتے، کتنے ہیں جن کو آندھی پانی سے بچنے کے لئے پیڑ کے سائے بھی نصیب نہیں ہوتے اور جن کی زندگی در بدر ٹھوکریں کھاتے گزر جاتی ہے۔ جس دنیا میں انسان کا یہ حال ہو اس میں اگر کسی کو محبت کا دکھ ہوا تو کون سی بڑی بات ہے۔ کملاوتی کم از کم مجھ میں اتنی ہٹ دھرمی نہیں ہے کہ جہاں لوگ بھوک کی مار کا رونا رو رہے ہیں، جہاں غلامی پر ماتم کیا جا رہا ہو، جہاں آزادی کی ایک سانس بھی لینے کو لوگ ترستے ہوں۔ وہاں میں محبت کے ایک دکھ کو دکھ سمجھوں اور اس پر آنسو بہاؤں!! یہ بے حمیتی ہے بہرحال اب تو میدان کارزار آگیا ہوں اور حوصلہ ہے کہ میرے خون کا ایک ایک قطرہ اس میدان میں کام آجائے اور مجھ پر یہ شعر صادق آئے۔

آنانکہ غم تو برگزیدند ہمہ
در کوئے شہادت آرمیدند ہمہ

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے ماں باپ زندہ نہیں جن کو

اپنے "یوسف گم گشتہ" کا غم ہو اور میں آزاد ہوں کہ جہاں چاہوں جا کر اپنی جان کی بھینٹ چڑھا آؤں۔ کملاوتی اب مجھے نہ یاد کرو۔ میں تم سے بہت دور چھوٹ گیا۔ خدا جامع المتفرقین ہے سنتے ہیں اس نے وسنتی اور نل کو ملایا تھا مگر میں تم کو نہیں ملسکتا۔ اب تم محبت کو "ایک فکر باطل" اور شمیم کو شمیم کا خواب سمجھ کر بھلا دو اور پھر شاد و بامراد رہو۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے تو اب بس ایک دھن ہے اور میرے لئے اسی میں مزا ہے

حلق پہ تیغ رہے سینہ پر جلّاد رہے

یا کم سے کم.... راہ میں دام رہے تاک میں صیاد رہے

تمہارا دلفگار ـــــ شمیم

کملاوتی نے یہ خط ختم کیا تو اس کو چکر آنے لگا، اس نے ایک آہ کی اور سر تھام لیا۔ وہ اس غم کو تو بھول گئی کہ شمیم اس سے عمر بھر کیلئے بچھڑ گیا ہے اس کو اب یہ دکھ تھا کہ اگر شمیم کے جانبازانہ ولولہ کا یہی عالم رہا تو پھر اس کا خدا حافظ ہے مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کیلئے کچھ نہیں ہو سکتا۔
کملاوتی کو شمیم کی طرف سے صرف ایک بات پر ملال تھا۔ آخر شمیم کو شادی کرنے کی اتنی جلد کیا ضرورت پڑ گئی، کیا کملاوتی کی محبت و وفا کا اتنا پاس بھی نہیں رہا کہ کچھ عرصہ تک شمیم اپنے دل میں کسی اور عورت کو جگہ

نہ دینا۔ کملاوتی نے لاکھ چاہا مگر یہ ملال اسکے دل سے نہ نکل سکا۔

(۳)

مایوسی کی ایک حد وہ بھی ہوتی ہے جہاں پہنچ کر انسان سکون اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی حالت پر غور کرنے لگتا ہے۔ کملاوتی اس حد پر پہنچ گئی تھی، وہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے لگی تھی کہ زندگی کے باقی دن گزارنے کی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔ شمیم کے ساتھ اس نے پہلی بار محبت کی اور یہی اس کی آخری محبت تھی جس کا حشر یہ ہوا۔ شمیم کی محبت میں وہ دین و دل کی بازی لگا چکی تھی۔ وہ گھر بار سب کچھ تج دینے کو تیار تھی۔ مگر جس کے لئے وہ یہ قربانیاں کرنا چاہتی تھی وہ ہاتھ سے یوں گیا۔ اب کیا رہا۔ اب تو کملاوتی کے ماں باپ جس کے ہاتھ میں اسکا ہاتھ دیدیں کملاوتی ایک حرف بھی اس کے خلاف نہ کہے گی۔ پھر کیا وجہ کہ وہ بھی شمیم کی طرح جلد سے جلد اپنے کو کسی کا پابند نہ کر لے، تاکہ اسکی پراگندگی روز بروز بڑھ کر کوئی خطرناک صورت نہ اختیار کر لے، اسکے والدین چاہتے تھے کہ بیٹی کی شادی گرجا شنکر سے کریں جس نے شمیم کے ساتھ ہی ایم۔ اے کیا تھا اور جو اپنے خاندانی وقار اور رسوخ کے بل پر ڈپٹی کلکٹری میں نامزد ہو گیا تھا۔

کملاوتی پڑھی لکھی اور تربیت یافتہ لڑکی تھی اور ہر معاملہ میں خود مختاری کا احساس رکھتی تھی، بالخصوص شادی کا معاملہ تو اسکے خیال میں ایسا تھا جسمیں

ماں باپ کو صرف مشورہ دینے کا حق تھا، آخری فیصلہ لڑکے اور لڑکی کا کام تھا، ماں باپ یا کنبہ والوں کو کسی قسم کے جبر کا کوئی اختیار نہیں، چنانچہ جبتک کملاوتی کو شمیم کا سہارا تھا وہ والدین سے صاف صاف کہتی رہی کہ وہ کبھی گرجا کے ساتھ شادی نہ کرے گی لیکن جب شمیم نہیں تو پھر کوئی ہو۔ اور اب اسکی زندگی میں کسی کا ہونا ضروری تھا جو شمیم کی جگہ زبردستی لے لے پھر گرجا ہی وہ کیوں نہ ہو؟ کملاوتی کے خمیر میں ضد اور طنز کا مادہ بھی کافی تھا، اسکو پہلے گرجا سے نفرت تھی۔ شمیم بھی گرجا سے چڑھتا تھا۔ کملاوتی شمیم کو نہیں تو کم از کم خود اپنے کو "جرم محبت" کی سزا دینا چاہتی تھی اور اسکی سخت ترین سزا یہ تھی کہ عمر بھر کے لئے گرجا کی ہو جائے۔ ہاں ابھی وہ ہچکچا ضرور رہی تھی اور وہ صرف اس لئے کہ کچھ دن اور بے قید و بند رہ کر سانس لے سکے، وہ گرجا سے شادی کرنے پر راضی تو ہو گئی تھی مگر ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ شادی کی رسم کب ادا کی جائے۔

اسی اثنا میں کملاوتی کو اطلاع ملی کہ شمیم بھارت ماتا کی جے لگاتا ہوا تین سال کے لئے قید سخت بھگتنے چلا گیا ہے۔ قید اور قید سخت! اور پھر وہ شمیم جس کی ایک انگلی کے دکھ جانے پر کملاوتی کا دل دکھ جاتا تھا! زمانہ بھی کیسی کیسی کروٹیں لیتا ہے اور کیسے کیسے تماشے دکھاتا ہے۔ شمیم قید میں نہ جانے کیسی کیسی سختیاں جھیل رہا ہے اور کملاوتی اسی آراستہ و پیراستہ

مکان میں ہے جو مکان نہیں نمونہ فردوس ہے۔ سامنے وہی پائیں باغ ہے جس کے ذوق انگیز اور ولولہ خیز سماں نے کتنی بار اسکے دل میں جوش پیدا کرکے اس کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ جائے اور شمیم کی آغوش محبت تلاش کرے۔ کملاوتی کا دل صحبت پارینہ کو یاد کرکے مرجھا رہا تھا۔ شمیم کی گرفتاری پر وہ خون کے آنسو رو رہی تھی۔ اس نے کئی روز تک لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا، دن رات وہ تھی اور شمیم کا تصور۔

در چمن بود زلیخا و بہ حسرت میگفت
یاد زندان کہ درو انجمن آرائے ہست

کملاوتی کی دماغی حالت نازک تھی۔ پہروں گرد و پیش سے بیخبر رہتی تھی۔ اسکی مجنونانہ بیخبری اور خود فراموشی بڑھ رہی تھی۔ کملاوتی جب ہوش میں آتی تو اپنی حالت پر غور کرتی اور اس کا ماتم کرتی۔ اسکی آشفتہ سری کا صحیح اندازہ صرف اُن لوگوں کو ہوسکتا ہے جنھوں نے اسکو اس حالت میں دیکھا ہے۔ ایسی حالت میں دوستوں اور عزیزوں کی صلاح نے بڑا کام کیا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا اور اس نے سہارا لے لیا۔ لوگوں نے کملاوتی سے کہا۔ "اب تم کو فوراً شادی کر لینا چاہیئے۔ تاخیر تمھارے حق میں مضر ثابت ہو رہی ہے۔" کملاوتی نے ہاں میں ہاں ملادی۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگی کہ اس کو کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہے۔ اس نے اپنے کو مالی

باپ کی رائے پر چھوڑ دیا اور انھوں نے ایک ماہ کے اندر اسکی شادی رچادی۔ کملاوتی گرجا کی بیوی ہوگئی۔

۴

شمیم نے چھ ماہ کے اندر وہ قیامت برپا کی کہ اراکین حکومت کے لئے اسے آزاد چھوڑے رہنا ناممکن ہوگیا۔ یہ عجیب بات تھی کہ شمیم نہ صرف مخالفین سرکار میں مقبولیت رکھتا تھا بلکہ اکثر ملازمان سرکار بھی اس کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے دردمندانہ خلوص اور مخلصانہ دلسوزی میں نہ جانے کہاں کی تاثیر تھی کہ وہ اپنے مخالفوں کو بھی اپنا قائل بنالیتا تھا۔ اکثر حکام درپردہ اس کی کوشش کر رہے تھے کہ شمیم کو قید فرنگ جھیلنے کی نوبت نہ آئے مگر بکرے کی ماں کے دن خیر مناتی۔ یہ نوبت بھی آگئی اور وہ ہنستا کھیلتا قیدخانہ میں داخل ہوگیا۔ شمیم کے ہمصفیروں کا بیان ہے کہ قید خانہ میں داخل ہوتے وقت اسکی زبان پر یہ اشعار تھے۔

گر کیا ناصح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا
خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگینگے کیا
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا

اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ میں چلا لیکن تم لوگ ہو، یہ حریت اور غلامی کی جنگ، یہ فاقہ کشی اور شکم سیری کی لڑائی رُکنے نہ پائے۔ جبتک تمہارے جسم میں ایک قطرہ لہو بھی باقی ہے۔ اسوقت تک پیچھے نہ ہٹو۔ تمہاری زندگی بھی ہے۔ تمہاری نجات اسی میں ہے ہاں تشدد اور دست درازی سے پرہیز کرتے رہو۔ ورنہ تمہاری شکست دھری ہے۔ قومیں جب تباہ ہونے کو ہوتی ہیں تو وہ ظلم، نا انصافی اور نفس پروری کی غلام ہو جاتی ہیں۔ اگر تم نے خود زبردستی کی اور ایثار و تحمل سے کام لیا تو تم کو اس لڑائی میں کامیابی کیونکر ہو سکتی ہے۔"

کملاوتی کو اخباروں کے ذریعہ برابر شمیم کی خبر مل رہی تھی۔ شمیم کی صحت قید میں خراب ہو رہی تھی۔ کملاوتی لاکھ چاہتی تھی کہ اب شمیم اور شمیم کی خیریت سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ مگر اخبار ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے کملاوتی کی آنکھیں جس چیز کو ڈھونڈھتی تھیں وہ شمیم کی خبر ہوتی تھی۔ شمیم چلا گیا تھا لیکن اپنا داغ کملاوتی کے دل میں چھوڑ گیا تھا اور یہ داغ مٹائے مٹتا نہ تھا۔ کملاوتی گرجا سے کبھی موانست نہ پیدا کر سکی گرجا تو خیر گرجا تھا۔ جس سے کسی زمانہ میں کملاوتی کو نفرت تھی۔ کملاوتی پر یہ حقیقت روشن ہو چکی تھی کہ آج گرجا کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا، تب بھی وہ اسی طرح بے دل و بے حوصلہ رہتی۔ شمیم اس کی زندگی ہمیشہ کیلئے بگاڑ گیا تھا۔

تین سال گزر گئے اور کملاوتی بحال نہ ہوئی۔ اس کے ایک لڑکا بھی پیدا
ہوا جو قریب سال بھر کا ہو کر جاتا رہا۔ جب تک گود میں لڑکا تھا کملاوتی ایک
حد تک جھوٹ سچ اس کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی تھی، قدرت کو یہ بھی
منظور نہیں تھا۔ لڑکے کے مرنے کے بعد کملاوتی کی زندگی میں اب دکھانے
کے لئے بھی کوئی دلچسپی یا کوئی مصروفیت نہ تھی۔ پہروں گزر جاتے تھے
اور اپنے کو کتب خانہ میں بند کئے بیٹھی رہتی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ کملاوتی
کتب بینی کر رہی تھی مگر کملاوتی ہی خوب جانتی تھی کہ وہ کس "یادگار" کی ورق گردانی
کر رہی ہے۔ اس سکوت اور گرفتہ خاطری کا اثر اس کی صحت پر پڑ رہا تھا۔
اس کا چہرہ نمایاں طور پر پژمردہ رہنے لگا تھا۔ اسکی آنکھوں میں کیفیت کے
بجائے اب ایک بے رونقی سی آگئی تھی۔ کبھی کبھی کسی کی خاطر سے اگر مسکرا
دیتی تھی تو اسکی مسکراہٹ جو "بہ صورت تکلف بہ معنی تاسف" کی ہو بہو تصویر
ہوتی تھی۔ اسکے "دل کے چور" کو بُری طرح رسوا کر دیتی تھی۔

شمیم اپنی میعاد پوری کر کے رہا ہوا مگر اس حالت میں کہ اسکی صحت میں
گھن لگ چکا تھا۔ رہائی سے کچھ عرصہ پہلے اس کو "سل" کا
عارضہ لاحق ہو گیا۔ مرض کی ابتدائی منزل تھی۔ اگر لاگ کے ساتھ نگرانی اور
علاج کرنے والا کوئی ہوتا تو صحت کی اُمید قوی تھی مگر ایسا کون تھا، ماں
باپ کی جاں نثارانہ شفقت سے وہ محروم ہو چکا تھا۔ انکے علاوہ "روز سیاہ" میں

کوئی کسی کا ساتھ کب دیتا ہے اور خود شمیم کو اپنی جان بے قرار کچھ ایسی عزیز نہ تھی، وہ تو زندگی اور موت کے سوال کو یہ کہہ کر ٹال چکا تھا۔

جی کو سر زندگی نہیں ہے

کیا جی کے کرو کہ جی نہیں ہے

قید سے آزاد ہونے کے بعد وہ دو مہینے تک لکھنؤ نہیں آیا اس خیال سے کہ کہیں کملاوتی کی آسودہ اور پُر سکون زندگی میں اسکی وجہ سے اب کوئی خلل نہ پڑے۔ شمیم کو معلوم ہو چکا تھا کہ کملاوتی گرجا کی ہو گئی ہے اور کامیاب و خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کے دل میں اس خبر سے ایک گھاؤ پڑ کر رہ گیا تھا۔ مگر اس نے نہ کملاوتی کو کوئی الزام دیا اور نہ ایک حرف کملاوتی کو کبھی لکھا۔

دو ماہ کے بعد شمیم کا مرض خطرناک صورت اختیار کرنے لگا، درجہ حرارت بڑھ گیا۔ منھ سے خون زیادہ مقدار میں آنے لگا۔ نقاہت بڑھنے لگی اور اب اس کو اُٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ مرض سرعت کے ساتھ غلبہ پا رہا تھا، شمیم زندگی سے مایوس ہو چلا اور اب اس کو کملاوتی کو آخری بار دیکھنے کی آرزو ہوئی اور اس آرزو سے چند ہی روز میں وہ اس طرح مجبور ہو گیا کہ فوراً اپنا مختصر سامان لیکر ایک دوست کے ہمراہ لکھنؤ چلا آیا دو چار روز تو رشتہ داروں نے اپنے "خون کی محبت" کا ٹڈے جوش کے

ساتھ مظاہرہ کیا اور شمیم کے سر پر قیامت برپا کئے رہے لیکن یہ ابال بہت جلد ختم ہو گیا اور پھر کہیں کچھ نہ تھا، اس کی لمحہ بہ لمحہ گرتی ہوئی حالت کی نگرانی اور فکر خود اپنے سر لینا تو ایک طرف کسی نے یہ پوچھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی کہ آخر شمیم کے علاج اور دیکھ بھال کی کیا صورت نکلی ہے۔

جس دن شمیم لکھنؤ آیا اسی دن کملاوتی کو معلوم ہو گیا تھا مگر وہ چار روز اس کا انتظار کرتی رہی کہ خود شمیم اس کو بلائے۔ شمیم یہ توقع لئے بیٹھا رہا کہ کملاوتی بغیر بلائے ہوئے آئے گی اور آخر کار وہ بغیر بلائے ہوئے آئی۔ شمیم کے بستر کے پاس آتے آتے اس کا جی بے قابو ہو گیا اور اسکی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگے۔ بچپن سے لیکر اب تک صرف چند مواقع اسکی زندگی میں ایسے آئے جب کہ وہ اُمڈی ہوئی طبیعت کو روک نہ سکا اور اسکے جذبات نے آنسوؤں کی صورت میں اپنے کو ظاہر کر دیا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ کملاوتی کے آنسو دیکھ کر اسکی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے دونوں خاموش دیر تک روئے اور خوب روئے۔ اس کے بعد شمیم نے ایک آہ کی اور کہا:۔

"بھول کر بھی ہمیں نہ یاد کیا
ہم ترے جی سے ایسے بھول گئے"

کملاوتی نے بڑے ضبط سے کام لیا اور کہا۔ "افسوس تمہاری حالت

ایسی نہیں کہ میں تمہاری باتوں کا جواب دوں اور اپنی جراحتوں کو بے نقاب کروں ورنہ تمہارا یہ کہنے کا منہ تھا نہیں"۔

شمیم نے مُسکرا کے کہا "اچھا کملاوتی آؤ ذرا میرے قریب بیٹھو تو میں تم کو دم توڑنے سے پہلے اپنی سرگزشت سُنا دوں۔ اس وقت میں تپ میں جلا جا رہا ہوں۔ شاید تمہارے ہاتھ کو ہاتھ میں لیلوں تو کچھ ٹھنڈک پڑے مگر اب تم شاید ہچکچاتی ہو، خود میں ہچکچانے لگا ہوں۔ تم تو کچھ اجنبی سی معلوم ہوتی ہو"۔

کملاوتی نے بات بڑھنے نہ دی اور شمیم کے پاس بیٹھ کے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا۔ شمیم نے اپنے حواس مجتمع کئے اور کہنا شروع کیا۔

"تم سمجھتی ہوگی کہ میں نے واقعی شادی کر لی تھی یا کرنے والا تھا غالباً اسی کی طرف تمہارا اشارہ تھا۔ آج تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ واقعہ اس سے زیادہ نہیں تھا کہ متمول گھرانے کی لڑکی جو تم سے کم پڑھی لکھی اور تربیت یافتہ نہیں تھی۔ میری محبت کا دم بھرنے لگی تھی۔ میری تقریروں نے اس پر بڑا اثر کیا تھا میری قابلیت اور میری جان باختگی نے اسکو گرویدہ کر رکھا تھا وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی، میں اسکی محبت کی قدر کرنے لگا تھا۔ لیکن تم جانتی ہو۔ میں نے کیا کیا۔ اس سے اپنی اور تمہاری محبت کا حال بیان کر دیا اور ہمیشہ کے لئے یہ کہہ کر قصّہ کو ختم کر دیا۔

یاد دلوائیں وہ آنکھیں نہ ہرن صحرا کے
ہم وطن سے ہیں اسی درد کے مارے نکلے

میرے لئے تو ناممکن سا ہو گیا تھا کہ کسی خوبصورت عورت کو دیکھتا اور تمہاری صورت سامنے آکر مجھے اس عورت کی طرف سے آنکھیں پھیر لینے پر مجبور نہ کر دیتی۔ اس لڑکی نے بھی جب دیکھا کہ میں اس کی محبت قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں تو وہ بھی صبر کر کے بیٹھ رہی۔ جس نادار لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا تھا وہ بھی مالدار تھی۔ رہ گیا یہ سوال کہ میں تم سے جھوٹ کیوں بولا؟ میرا خیال ہے کہ کم از کم تم کو اس "مصلحت آمیز" جھوٹ پر مجھ سے جواب طلب کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ میں نے اپنے لئے جھوٹ نہیں بولا تھا"۔

کملاوتی کے لئے یہ ایک نئی خبر تھی، وہ شمیم کا منھ تک رہی تھی۔ شمیم نے بات ختم کی تو کملاوتی بڑی دیر تک سر تھامے بیٹھی رہی۔ پھر کہنے لگی:۔

اُف! شمیم میں کیا جانتی تھی کہ تم ایسے دھوکے دے دے کر مجھے گڑھے میں گراتے چلے جاؤ گے، میں نے شادی صرف اس ضد میں کی کہ تم نے شادی کر لی ہے مگر تم تو جہاں تھے وہیں رہے اور مجھ کو ڈبو دیا۔

"سچ کہنا کملاوتی، ڈوبا میں یا تم؟" شمیم نے ایک پندار کیساتھ پوچھا۔

"میں شمیم میں، تم تو بہر حال اچھے رہے" کملاوتی نے اعتماد کے

ساتھ جواب دیا۔

"اور یہ خون کون تھوک رہا ہے"؟

"تم۔ مگر تمہیں خون تھوک تھوک کر مر جانا اور سارا جھگڑا پاک کر دیتا ہے اور مجھے دق میں زندہ رہنا ہے۔ آہ! میرے مقدر میں یہ بھی نہیں کہ میں خون تھوکوں، حالانکہ میرا دل خون ہوا جا رہا ہے"۔

"تو کیا تم خوش اور آسودہ نہیں ہو؟" شمیم نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کا جواب دینے کی مجھ میں تاب نہیں ہے" کملاوتی نے کہا اور ایک آہ کر کے رہ گئی۔

شمیم کو حقیقت حال اب معلوم ہوئی۔ کملاوتی کی حسرتناک زندگی کا اس کو احساس اب ہوا۔ اس نے بیساختہ کملاوتی کو لپٹا لیا اور اپنے کُرتے کے دامن سے اسکے آنسو پونچھنے لگا۔ کملاوتی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "شمیم تمہارے دل اور تمہاری روح کی حالت تو مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر جسم کے ساتھ روح بھی نیست ہونیوالی نہیں ہے اور اگر مرنے کے بعد روح کا باقی رہنا یقینی ہے۔ تو میری روح کو مرنے کے بعد بھی تمہاری آرزو چین نہیں لینے دے گی۔ تم مجھے نہیں ملے۔ یہ درد کئی جنم تک رہے گا۔ کاش تم اب سے بھی اچھے ہو جاتے تو میں ایک بار پھر تم کو پا لینے کی کوشش کرتی۔ تمہارا سودا لیکر میں کیا

نہیں کر سکتی۔ افسوس تم نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا اور واقعات کو مجھ سے چھپا کر جو جی میں آیا کر ڈالا ورنہ آج نہ تم مٹی میں ملتے اور نہ میں زندہ درگور ہوتی مگر اب تو حسرت ہی حسرت رہ گئی ہے۔"

شمیم نے کہا "خیر گزشتہ کا ذکر ہی کیا، آئندہ کے متعلق میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر بفرض محال میں اس پیغام موت سے جانبر بھی ہو گیا تو زیادہ امکان اسکا ہے کہ میں پھر اسی اکھاڑہ میں پہونچ جاؤں۔ کملاوتی اب میں محبت کا اہل شاید نہیں جو شخص محبت کو عنقا سمجھنے لگا ہو۔ وہ بھلا محبت کیا کر سکے گا۔ میں نے محبت کی اور محبت کو دیکھ لیا۔ آہ!

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

کملاوتی ایک بار پھر شمیم میں محو ہو گئی۔ وہ کچھ عرصہ تک اس حقیقت کو بھول گئی کہ وہ دوسرے کی بیوی ہے۔ اس کو اپنی پابندیوں اور ذمہ داریوں کا بالکل احساس نہیں رہا۔ اب وہ دن رات شمیم کے پاس رہتی تھی اور اس کی تیمارداری کرتی تھی۔ گرجا مصلحتاً خاموش تھا کملاوتی نے اچھی خاصی رقم شمیم کے علاج میں صرف کر ڈالی۔ لکھنؤ کا کوئی ڈاکٹر یا حکیم ایسا نہ تھا جس نے شمیم پر اپنے نسخے نہ آزمائے ہوں۔ کملاوتی یہ اُمید لئے ہوئے تھی کہ شمیم اچھا ہو جائے گا مگر ایسی امیدیں عموماً طلسم کی

طرح ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔ کملاوتی کی امید کا بھی یہی حشر ہوا۔ غم کی بیماری نے شمیم کا کام تمام کر کے دم لیا۔

(۶)

شمیم کی اُٹھتی جوانی کی موت نے کملاوتی کی زندگی کو اور بھی تاریک کر دیا۔ حسرت اور عبرت کے مخلوط احساس نے اس کو اب اس قابل بھی نہیں رکھا کہ وہ گرجا کے ساتھ دنیاداری برت سکے اور اپنے فرائض کو بُرے بھلے ادا کرتی رہے۔ شمیم اپنی ناکام محبت کے ہاتھوں مٹ کر خاک میں مل گیا اور وہ گرجا کے ساتھ سکون سے بسر اوقات کرے، یہ اس سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ وہ اس جانکاہ واقعہ کی یاد کو بھلا دے مگر دم توڑتا ہوا شمیم ہر وقت اسکی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ زندگی اور موت کی کشمکش اس کے دماغ کو بیکار کر گئی تھی۔ اب وہ تجرد اور تنہائی میں زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن ایک شادی شدہ عورت کیلئے یہ کب ممکن تھا۔ کملاوتی کے پاؤں میں زنجیر تھی جس کا توڑنا آسان کام نہ تھا۔ گرجا بر شوہروں میں سے تھا۔ کملاوتی جانتی تھی کہ اگر اس نے گرجا سے بے رُخی شروع کی تو بڑا فساد کریگا، کملاوتی نے حتی المقدور نباہنا چاہا لیکن بیگانگی کے تیور چھپ نہ سکے۔ گرجا پر ظاہر ہو گیا کہ کملاوتی اس سے پناہ مانگتی ہے۔ اس نے کملاوتی پر جبر کرنا شروع کیا، اب کملاوتی بغاوت پر آمادہ ہو گئی

مجتمع کرنا تھا۔ پہلی شورش کے پورے پورے نو برس بعد ملک میں ایک بار پھر کسی گوشہ سے حریت کا نعرہ لگا۔ منتظر قوم میں پھر حرکت اضطراب کے آثار نمایاں ہوئے اور دیکھتے دیکھتے ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھر وہی طوفان برپا ہو گیا۔ بیڑیوں کے شیدائی "ہرچہ بادا باد" کہہ کر جھومتے ہوئے آگے بڑھے۔ حکومت کی طرف سے روک تھام شروع ہوئی۔ مجرموں نے ستیہ گرہ کی قسم کھالی، معاملہ بڑھتا گیا نہ ادھر سے "ذوق اسیری" کی کمی، نہ ادھر سے دار و گیر میں ڈھیل، قید خانے آباد ہو گئے، ہر طرف طوق و سلاسل کی جھنکار سے فضا گونجنے لگی۔ اس مرتبہ ستیہ گرہ میں عورتیں بھی شریک ہوئیں۔ ہر عورت کو یہ حوصلہ کہ وہ میدان میں "جون آف آرک" بنے، اس سے تحریک نے اور بھی زور پکڑا۔

کملاوتی کو اسی تحریک نے شمیم سے چھڑایا تھا اور اسے اس حالت کو پہنچا دیا تھا۔ اس تحریک نے شمیم کو برباد کر دیا۔ اسی میں اس کو بھی برباد ہونا چاہیئے۔ کملاوتی نے مصمم ارادہ کر لیا کہ لکھنؤ میں علمبرداری نہیں تو کم از کم دوسروں کی پیروی ضرور کریگی، اب اس کی زندگی میں ذاتی دلچسپی کا سامان تو تھا نہیں جس کے لئے وہ اس پرآشوب روزگار سے الگ رہتی۔ پھر کیا وجہ کہ اپنی ناشاد و نامراد زندگی کو ایک کارِ خیر میں نہ لگائے اس کے علاوہ شمیم کی محبت اور اسکی یاد کا تقاضا بھی یہی تھا، کملاوتی

اس کی بغاوت کا نہ جانے کیا انجام ہوتا۔ لیکن عجب اتفاق کہ اسی درمیان میں ایک دن گر جا گھوڑے سے گرا، سر میں چوٹ آئی اور دماغ کو ایسی ضرب پہنچی کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر مر گیا۔ یہ شمیم کے مرنیکے دو برس بعد کا واقعہ ہے۔

کملاوتی آزاد تھی مگر اس کی آزادی رائگاں تھی، کاش اس وقت شمیم زندہ ہوتا۔ کملاوتی کی زندگی کے اب صرف دو مشغلے تھے۔ کتب بینی اور شمیم کی یاد، صبح شام وہ گھر سے باہر نکلتی تھی اور ان مقامات پر جاتی تھی جہاں وہ اکثر شمیم کے ہمراہ سیر و تفریح کیا کرتی تھی، باقی اوقات وہ اپنے دار المطالعہ میں گزارتی تھی، اب نہ اسمیں وہ شگفتگی تھی نہ وہ بھولا پن قیافہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں رہتی ہے جو اس کو دیکھتا تھا وہ اسکی اس حالت پر بغیر افسوس کئے نہ رہتا تھا۔

(۷)

شمیم کو مرے ہوئے چھ برس ہو گئے اس دوران میں ہندوستان پر پھر ایک سیاسی جمود چھا گیا تھا، کانگریس کے دفتر کے باہر اب کسی قسم کی بیداری اور بیچینی کا نام بھی باقی نہ تھا۔ سارا ہنگامہ گرد کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ حکومت اور عوام الناس دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ ملک نے ہمت ہار دی ہے اور اس کی تمام تاب مقاومت فنا ہو چکی ہے۔ لیکن حقیقتاً ملک نے ایک بار اپنی قوتوں کا اندازہ کر لیا تھا اور انکو صرف

اس مسئلہ پر ابھی غور کر رہی تھی کہ ایک دن وہ ایک کانگریسی جتھے میں شریک ہو کر اس مقام پر پہنچی جہاں نمک بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، ستیہ گرہیوں میں ایک ممتاز شخص وہ بھی تھا جسنے سرکاری ملازمت کو لات مار کر قوم کا جوگ لے لیا تھا اور جانباز ان ملک و ملت میں آکر شریک ہو گیا تھا۔ نمک سازوں کو جس وقت گرفتار کیا گیا ہے۔ اُسوقت اس جانباز کا ہنستا ہوا مکھڑا دیکھنے کے قابل تھا، اسکے تیور شمیم کے تیور سے بہت کچھ ملتے تھے، اُس نے یہ شعر پڑھتے ہوئے اپنے کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

ان دنوں جوش جنوں ہے ترے دیوانے کو

طوق و زنجیر لئے پھرتے ہیں پہنانے کو

کملاوتی کے دل میں رہ رہ کر ہوک اُٹھنے لگی۔ شمیم کی صورت نگاہوں میں پھر گئی۔ اس کی طبیعت اُمڈی مگر اب اس میں رونے کی تاب نہ تھی، اس نے طے کر لیا کہ دوسرے دن سے اس کو کیا کرنا ہے۔

کملاوتی روز اپنی ٹولی کو لیکر نمک بناتی تھی۔ روز نعرے لگاتی تھی۔ روز جلوس لیکر نکلتی تھی اور روز سمجھتی تھی کہ کوئی "طوق و زنجیر" لئے آتا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

نمک کا شور کم ہوا۔ بدیشی کا محاسبہ اور مقاطعہ شروع ہوا، بدیشی کپڑے کی دُکانوں کا محاصرہ کرنیوالی عورتوں میں کملاوتی سب سے آگے تھی۔

صبح سے شام تک وہ دکانوں کے سامنے کھڑی رہتی، اور لوگوں کو اپنے "افسون التجا" سے بدیشی کی خریداری سے باز رکھتی۔ نہ اسکو بھوک پیاس کا ہوش تھا، نہ دھوپ کا۔ اس بے اعتدالی کا اثر اسکی صحت پر بہت جلد پڑ گیا۔ اس کو خفیف حرارت رہنے لگی، اب بھی کملاوتی باز نہ رہی اور شمیم کی یاد میں اپنا کام کرتی رہی۔

حرارت نے اب بخار کی صورت اختیار کر لی اور کملاوتی مجبور ہو گئی ڈاکٹروں نے کچھ عرصہ تک تپ محرقہ کا علاج کیا مگر بہت جلد اپنی رائے بدل دی، اب ان کو دق کا گمان ہے۔ چار ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور بخار اپنی جگہ قائم ہے۔ کھانسی بھی ہے، ڈاکٹری تشخیص سے الگ ہو کر اگر عوام سے بھی پوچھا جائے تو وہ "پرانا بخار" بتا دیں گے جس سے جانبر ہونا مستثنیات میں سے ہے، کارخانہ قدرت میں معجزات کی کمی نہیں لیکن قیاس ہے کہ کملاوتی کا عارضہ وہی ہے جو شمیم کا تھا اور اس کا بھی وہی حشر نظر آتا ہے اور بہت جلد شمیم سے جا کر مل جانے والی ہے۔ اس خیال سے اس کی روح مطمئن ہے اگر اس کے عزیزوں یا دوستوں میں سے کوئی بھی کہہ دیتا ہے کہ کملاوتی اچھی ہو جائے گی تو وہ تیوری چڑھا لیتی ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی صحت کے خیال کو دل میں جگہ دے کر اپنی آئندہ

زندگی کی اُمیدوں پر پانی پھیرنا گوارا نہیں کر سکتی۔ سُنا گیا ہے کہ اسکی زبان پر آج کل ہر وقت وہ شعر رہتا ہے جس کو شمیم نے مرنے سے پہلے کئی مرتبہ کملاوتی کے سامنے پڑھا تھا۔

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

سنہ ۱۹۳۰ء



صنّاع کا راز

"یا صورتے کش این چنیں یا ترک کن صورت گری"

کسی زمانہ میں ایک مصوّر تھا جو بڑی محنت و کاوش اور بڑے شوق و انہماک کے ساتھ ایک تصویر بنا رہا تھا۔ تصویر میں صرف ایک رنگ استعمال کیا جا رہا تھا لیکن دیکھنے والے ابھی سے اسمیں محو ہو کر رہ جاتے تھے۔ دوسرے مصوّروں نے یہ دیکھ کر تصویریں بنانا شروع کیں اور طرح طرح کی رنگ آمیزیاں کیں اور اپنے دست و قلم کے کمال دکھائے مگر کسی کی تصویر میں وہ ندرت اور دلکشی نہ پیدا ہو سکی جو ہمارے مصوّر نے صرف ایک سُرخ رنگ سے پیدا کر دی تھی حریفوں کو حیرت تھی کہ آخر یہ رنگ کہاں سے حاصل کیا گیا ہے جس نے دنیا کے تمام رنگوں کو اکیلے مات کر رکھا ہے۔ لوگ بار بار مصوّر سے پوچھتے "تم نے یہ نرالا رنگ کہاں پایا؟" مصوّر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا جواب دے اور وہ مُسکرا کر چپ رہ جاتا تھا۔

حریفوں نے اس نایاب رنگ کی تلاش میں دور دراز ملکوں کی خاک چھاننا شروع کی، کوئی کہیں گیا۔ کوئی کہیں۔ بہتوں نے کیمیا پر غور بامعنہ

کتنی پرانی کتابیں پڑھ ڈالیں اس امید میں کہ شاید کوئی ایسا نادر نسخہ ہاتھ لگ جائے جس سے یہ رنگ بنایا جا سکے۔ مگر سب کی کوششیں رائگاں ثابت ہوئیں مصور اپنا کام کرتا رہا، اسکی تصویر روز بروز زیادہ سُرخ اور زیادہ جمیل ہوتی گئی اور خود سپید ہوتا گیا۔

آخرکار ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ تصویر مکمل تیار ہو گئی اور مصور اس کے سامنے مرا پڑا ہے۔ لوگ اُسے اٹھا کر دفن کرنے کیلئے لے گئے جب تجہیز و تکفین کیلئے اسکے کپڑے اُتارے گئے تو اُس کے سینہ پر بائیں طرف ایک زخم کا نشان نظر آیا جو پرانا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ عمر بھر اس کے سینے پر رہا ہے۔ زخم کے لب خشک تھے اور موت نے اپنی مہر لگا کر اسکا منھ بند کر دیا تھا جس طرح ہر چیز پر وہ اپنی مہر ثبت کرتی ہے۔

یار و اغیار مصور کو سپرد خاک کر کے چلے آئے مگر اُن کی حیرت ابتک باقی تھی کہ آخر وہ اپنی تصویر کیلئے رنگ کہاں سے لاتا تھا۔ دن گزرے مہینے گزرے، سال گزرے، ہوتے ہوتے مدت گزر گئی، مصور کو لوگ بھول گئے، اس کا نام و نشان دنیا سے مٹ گیا لیکن اسکا کارنامہ غیر فانی تھا جو ہمیشہ کے لئے یادگار رہا۔

سنہ ۱۹۳۱ء

گوہر محبت

موتی جواہرات میں ایک ممتاز مرتبہ رکھتا ہے اسکی آب و تاب ضرب المثل ہو گئی ہے۔ دنیا اس کو تشبیہ و استعارہ کی صورت میں استعمال کرنے لگی ہے۔ چنانچہ آج جس زبان کے ادبیات کا مطالعہ کیجئے آپ کو "گوہر مقصود" جیسی ترکیبیں اکثر ملیں گی۔ یہی نہیں بلکہ واعظوں اور ناصحوں کی زبان پر ایسی ترکیبیں چڑھ گئی ہیں۔ اس چھوٹی سی چیز کو اسقدر اہمیت شاید اس لئے دی گئی ہے کہ وہ ایک ذی حیات کی مشقّت سے پیدا ہوتا ہے اور ایک ذی شعور کی جاں فشانیوں سے دستیاب ہوتا ہے وجہ جو کچھ بھی ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ "طالع گہر" کا "اوج" ہمیشہ رشک کی نگاہوں سے دیکھا گیا اور "گوہر فروش" کا "ستارہ" ہر جگہ اور ہر زمانہ میں بلندی پر رہا۔ میں خود اس معاملہ میں کوئی رائے نہیں رکھتا، موتیوں کی دھندلی چمک میں میرے لئے کوئی دلکشی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ معشوق کے دانتوں یا آنسوؤں کے قطروں کو تشبیہ دینے کیلئے

اس سے بہتر اور زیادہ موزوں چیزوں کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔ نہ جانے کیوں موتی اسقدر ہر دلعزیز اور مقبول خاص و عام ہو گیا۔

"گوہر محبت" فی الحقیقت ایک تمثیلی افسانہ ہے جس سے اکثر فارسی جاننے والے آشنا ہوں گے۔ یہ مسئلہ مدتوں زیر بحث رہ چکا ہے کہ اسکی تفسیر کیا ہو سکتی ہے۔ آیا یہ دکھانا مقصود ہے کہ حسن و عشق غیر فانی اور سرمدی ہیں یا دونوں کو بے بنیاد اور مایا جال ثابت کرنا ہے میں خود کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا تاہم میرے خیال میں اس افسانہ کی تین طرح سے تاویلیں کی جا سکتی ہیں' ایک تو بہت سطحی ہے یعنی یہ کہ درجہ کمال کو پہنچی ہوئی کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ درجہ کمال کا یہ مفہوم ہے کہ اب آگے کوئی درجہ نہیں اور جو شے کمال حاصل کر چکی وہ یا تو رک جائے گی یا پیچھے ہٹے گی لیکن سکون اور حرکت معکوس دونوں اقتضائے فطرت کے خلاف ہیں۔

دوسری تاویل یہ ہے کہ زندگی میں جس چیز کے لئے ہم سب کچھ کرنا چاہتے ہیں اسی کا وجود ہمارے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور ہمارے کاموں کو امیدوں اور خواہشوں کے خلاف بدنما بناتا چلا جاتا ہے۔ ہم جس کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور جس پر اپنا سارا سرمایۂ حیات نثار کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اسی کی بہبود کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس سے دستکش ہو جائیں اور اسی میں ہماری بہبود ہے "مہابھارت" پر

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سلطنت کے لئے جن لوگوں کو خون کی ندی میں نہانا پڑا، انھیں لوگوں نے آخر میں اپنے فلاح کی صورت یہ دیکھی کہ تاج و تخت سے منھ موڑ کر پہاڑوں میں زندگی کے باقی ماندہ دن گزار دیں۔ رامائن کو لیجئے جس سیتا کے لئے رام کو ایسے صعب گزار راستے طے کرنے پڑے جس نے رام کی رفاقت کے لئے بن باس لیا، اسی سیتا سے آخر کار رام کو جدا ہونا پڑا۔ یہ کوئی رام کا ظلم نہ تھا۔ کوئی بے اعتنائی نہ تھی، کوئی بے اصولی حرکت نہ تھی، جیسا کہ اکثر کا خیال ہے اور بعض نہ جاننے والے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ بلکہ سیتا اور رام دونوں کی اگر سچ پوچھئے تو نجات اسی میں تھی میں اس بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس افسانہ میں "تیاگ" کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ "تیاگ" کی خواہش انسان میں کیونکر پیدا ہوتی ہے اور اس کا سنگ بنیاد کون سا جذبہ ہے۔

تیسری تاویل بہت مختصر اور معمولی ہے جو ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آسکتی ہے، اس قصہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی چیز کی یادگار قائم کرنا نفس انسانی کی باطل پرستی ہے، ورنہ جو بات ایک بار ہو چکی وہ بجائے خود ایک یادگار ہے، صدیاں گزرتی جائینگی مگر وہ یادگار مٹ نہیں سکتی۔ انسان جھوٹی تسکین حاصل کرنے کیلئے

یادگاریں قائم کرتا ہے لیکن ان سے کبھی اس کو تسکین نہیں ہو سکتی۔ غالب کا یہ مصرعہ بھی اپنے خاص انداز میں اسی فلسفہ کی تعلیم دیتا ہے۔

"بھول جانا ہے نشانی میری"

محبوب اگر مر جائے تو جہاں تک ممکن ہو تو اس کا نشان مزار بھی نہ باقی رہنے دو تاکہ اس کی یادگاریں ایک تخئیل مطلق کے سوا کچھ نہ باقی رہے۔ مادیات کا ایک ذرہ بھی اس کو آلودہ نہ کر سکے اس قسم کی یادگار کبھی فنا نہیں ہو گی اگر یہ سچ ہے کہ قادر مطلق غیر فانی ہے۔

افسانہ بہت چھوٹا ہے لیکن اس کی تاویلیں ادبیات فارسی کا ایک خاص جز و بن چکی ہیں۔ شاعروں نے اس پر حاشیے چڑھائے اور اس کے متعدد مطالب بیان کئے۔ مذہبی پیشواؤں نے موقع پاکر موت و زندگی، حشر و نشر، جسم و روح کے نہ جانے کتنے مسائل حل کر ڈالے۔ "ماہرین جمالیات" نے بھی اس میں حصہ لیا اور افسانہ کے رنگ میں رنگ دیا اور بعض نے تو یہ کہہ دیا کہ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے جس کی تردید نہیں کی جا سکتی۔

قصہ شمالی ہند سے متعلق ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جو کسی زمانہ میں حسن و محبت کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ بار آور ملک تھا اور شاید اب بھی ہے۔ اس زرخیز سرزمین پر سورج کی کرنیں ہمیشہ اپنا خزانہ

پنچھاور کر رہی تھیں۔ جنگلوں اور پہاڑیوں کی دلفریب فضا فطرت کی عنایتوں کی خاص مثال تھی۔ وہ خوشگوار جھیلیں، وہ شاداب وادیاں، وہ سرسبز میدان، وہ برف پوش چوٹیاں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدمؑ و حوّا کی جنت یہی رہی ہوگی، جہاں یاس و حرماں، بے دلی اور افسردگی جیسے الفاظ کے کوئی معنی نہ تھے۔ ہرن اس طرح چوکڑیاں بھرتے گویا درندوں کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ تھا، چڑیاں اس طرح چہچہاتی تھیں جیسے شکاریوں کا کھٹکا ان کے لئے کوئی چیز نہ تھا، اس ملک کے بسنے والے زندگی میں کوئی کمی نہ محسوس کرتے، ان کا نوجوان بادشاہ اگر ایک طرف اپنی صورت میں بےمثل تھا تو دوسری طرف عقلمندی اور دوراندیشی میں آپ اپنی نظیر تھا، مطلق العنان ہونے کے باوجود وہ رعایا کی مصلحتوں کو مقدم سمجھتا، اس کے قلمرو میں اور بہت سی ریاستیں تھیں اور گردونواح میں وہ شاہنشاہ سمجھا جاتا تھا مگر وہ خود اپنے کو ملک اور رعایا کا خادم تصور کرتا تھا، بادشاہ کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی، اس کو جب کبھی امور سلطنت سے فرصت ملتی تو وہ سیر و شکار سے اپنا جی بہلایا کرتا آخرکار اس کو ایک ایسی حسین لڑکی مل گئی جو حسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھی معصوم بادشاہ حسن کی ذوق انگیزیوں سے آشنا ہوگیا اور اس کو معلوم ہوا کہ محبت ایک مزے کی چیز ہے۔ اس نے اس چاند کے ٹکڑے کو اپنے تاج و

تخت میں شریک بناکر محبت کو مستحکم اور پائدار کرلیا، غریب و نادار
لڑکی ملکہ ہو گئی۔ اب بادشاہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ اس کو اس جنم میں
کسی چیز کی حاجت نہیں ہے۔ ملکہ بھی بادشاہ کی محبت میں دنیا و مافیہا
سے بیخبر تھی، دونوں کی زندگی محبت سے معمور تھی۔ دن رات اُن کے
تھے، جینا اُن کا تھا، دنیا اُن کی تھی، تلخکامی سے وہ ناآشنا تھے۔ رنج
و مصیبت کا اُن کو تجربہ نہ تھا۔ دونوں سمجھ رہے تھے کہ جینا نام ہے
صرف لذت کا۔ ایسی کامیاب محبت کا خواب بھی کم لوگوں نے
دیکھا ہوگا۔

اس بیخبری کے عالم میں ایک زمانہ گزر گیا۔ دفعتہً زمانہ نے کروٹ
بدلی، کارپردازان قضا و قدر نے نظام عالم کو از سر نو ترتیب دینا
چاہا تو اُن کی نگاہ ان دو خوش نصیب محبت کے متوالوں پر بھی پڑی
ایک دن کا ذکر ہے کہ بادشاہ ملکہ کے ساتھ باغ میں چاندنی رات کا
لطف اُٹھا رہا تھا، ملکہ چاند سے ناخوش تھی، وہ اُس کی بیباک اور
شوخ نگاہی کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ یکایک وہ سراسیمہ ہوکر چونک پڑی۔
اور اُس کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی۔ بادشاہ نے مڑکر دیکھا تو اُسکے
پانوں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے
اندھیرا چھا گیا۔ ملکہ کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے

چاہنے والے کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گئی

آدھی رات ہو چکی تھی، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، پھولوں کی مہک فضا میں بس رہی تھی، بادشاہ کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، اس نے کبھی موت نہیں دیکھی تھی، وہ غور سے اُس چہرہ کو دیکھ رہا تھا جس میں موت نے ایک نئے رنگ کا اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے سوچنے کی قوت زائل ہو رہی تھی۔ اُس کو کسی طرح یقین نہ ہوتا تھا کہ ملکہ اُس سے یا وہ ملکہ سے عمر بھر کیلئے چھوٹ گیا ہے۔ وہ اس خوفناک حقیقت کو سمجھنے سے معذور تھا کہ اب کبھی ملکہ اسکے ساتھ سیر کرنے باغ میں نہیں آئے گی۔

دو روز تک بادشاہ ملکہ کی لاش کے قدموں سے لگا رہا اور خاموشی کیساتھ ماتم کرتا رہا، ارکان دولت کو خوف تھا کہ کہیں وہ اس جانکاہ صدمہ سے مغلوب ہو کر خودکشی نہ کرلے، ہر شخص اپنی اپنی جگہ بادشاہ کا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر بادشاہ بچہ نہیں تھا، تیسرے روز وہ خود بخود اُٹھا اور کھا پی کر بدستور اپنے ملک کے ضروری کاموں میں مصروف ہو گیا، انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے کوئی زبردست ارادہ کر لیا ہے جس سے اس کو بہت کچھ سکون ہو گیا ہے۔

اس نے لاش کو ایک چاندی کے صندوق میں محفوظ کیا، اور اُس کو پھر ایک صندل کے صندوق میں رکھا جس پر سونے کا کام کیا ہوا تھا، اس

چٹانیں کاٹ کاٹ کر یہ عمارت بنوائی گئی تھی جس کا شمار نوادر عالم میں تھا۔ چاروں طرف سبزہ زار پہاڑیاں تھیں اور بیچ میں "گوہر محبت" ایک جانب دریا لہریں لے رہا تھا جو عمارت کو اور بھی پر شکوہ بنائے ہوئے تھا "گوہر محبت" کے وسط میں ملکہ کا مرمریں تابوت تھا، اسکے گرد قیمتی پتھروں کے ستون کھڑے ہوئے تھے، صناعی کے بہترین نمونے تھے۔

پہلے "گوہر محبت" کی عمارت بہت چھوٹی تھی مگر رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، پہلے اسمیں اتنے گنبد اور کنگرے نہ تھے جتنے کہ بعد میں ہو گئے اسکے طاق و رواق اور در و دیوار کے نقش و نگار ہمیشہ نئی اور پہلے سے زیادہ دلکش صورت اختیار کرتے رہے۔ بادشاہ جب اس کو دیکھنے آتا تو اسمیں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی پاتا اور اپنی تخئیل کے مطابق کوئی ترمیم یا اضافہ کرا دیتا۔ زائرین آتے اور "گوہر محبت" کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ عورتیں دیکھتیں اور کہتیں "دیکھو محبت بھی کیا چیز ہے۔ کیسے کیسے کرتب دکھاتی ہے"، مگر بادشاہ کو کسی نہ کسی طرف سے اُس میں خامیاں نظر آجاتی تھیں اور وہ مضمحل ہو جاتا تھا، اسی طرح اس کی آدھی عمر گزر گئی اور ملکہ کی یادگار معیار پر پوری نہیں اُتری، اب بادشاہ اور بھی جوش اور انہماک کیساتھ اس بات پر تُل گیا کہ "گوہر محبت" کو اپنی تخئیل کے لحاظ سے درجہ کمال تک پہونچا دے۔ ہر سال محراب اور مینار نئی طرز پر بنائے

صندوق کیلئے ایک اور سنگ مرمر کا تابوت بنوایا گیا اور اُسمیں قیمتی جواہرات جڑوائے گئے۔ اس درمیان میں بادشاہ ان کنجوں اور سیر گاہوں میں جا کر ملکہ کی یاد میں اپنا جی بہلایا کرتا تھا، جہاں وہ اسکے ساتھ فرصت کا بیشتر حصہ صرف کرنے کا عادی تھا۔ اُس نے نہ کپڑے پھاڑے نہ چہرہ پر راکھ ملی جیسا کہ اُس زمانہ کی رسم تھی۔ کچھ دنوں بعد وہ پھر دربار کرنے لگا اور ملک کے انتظام کی نگرانی شروع کر دی۔ اُس نے اہل دربار کو اپنے ارادہ سے آگاہ کرنے کے لئے کہا "میں اب کسی عورت سے سروکار نہ رکھونگا بلکہ عورت کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں گا اس لئے میں کسی ایسے لڑکے کو گود لینا چاہتا ہوں جو میرا وارث بننے کی قابلیت رکھتا ہو لیکن اسکے علاوہ میں اپنی ساری زندگی، ساری طاقت اور ساری دولت ملکہ کی ایک یادگار تیار کرانے میں صرف کر دوں گا جو ملکہ کی طرح دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتی ہو۔ جو ہر زمانہ میں ایک انوکھی چیز سمجھی جائے اور جسکی دید کے شوق میں لوگ دور دور سے آئیں اور ملکہ کو یاد کریں تاکہ ہماری محبت فانی نہ رہ جائے۔"

اہل دربار نے بادشاہ کی رائے سے اتفاق کیا۔ ایک مقبرہ کی بنیاد ڈالی گئی جس کا نام "گوہر محبت" رکھا گیا۔

سال پر سال گزر رہے تھے اور "گوہر محبت" کی تعمیر کا سلسلہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا تھا اور نہ بادشاہ کی سرگرمی میں سرمو فرق آیا تھا، ہماری

جاتے۔ نئے نئے قسم کے جواہرات آتے اور اُن کی پچی کاری ہوتی۔ پُرانے نقوش اور کتبے مٹادئے جاتے اور اُن کی جگہ نئے کندہ کئے جاتے بادشاہ کا مذاق آہستہ آہستہ بدل رہا تھا۔ اس کو سنہرا رنگ اب بالکل مرغوب نہیں تھا، چنانچہ اس کی جگہ آسمانی رنگ نے لے لی تھی۔ کچھ مدت بعد اس کے مزاج میں اسقدر سادگی آگئی کہ اُس نے تمام نقش و نگار جن کو اب وہ بچپن کا کھیل سمجھنے لگا تھا مٹوادئے۔ پھر بھی دیکھا تو "گوہر محبت" کو نامکمل اور معیوب پھر پایا۔ بادشاہ حیران تھا کہ اب کیا کرے۔ بہت غور کرنے کے بعد اس نے ایک دن حکم دیا کہ اگر ان پتھر کے ستونوں کو گرادیا جائے تو تابوت زیادہ خوشنما نظر آئے گا۔ حکم کی تعمیل ہوئی مگر "گوہر محبت" میں اب بھی کوئی نقص باقی تھا۔ دوسرے دن بادشاہ پھر آیا اور تابوت کو غور سے دیکھنے لگا۔ بڑی دیر تک تامل کے بعد اُس نے معمار سے کہا:۔

"اب تو اس میں بجز ایک چیز کے اور کوئی نقص نہیں معلوم ہوتا اور وہ یہ تابوت ہے جو نہایت بدنما اور غیر ضروری معلوم ہوتا ہے اس کو یہاں سے فوراً اٹھالے جاؤ۔"

۲۷ ۱۹ ۶ ۳ء

ظفر کا باپ

(۱)

دوپہر کا گھنٹہ بجا اور جمال پور کے مدرسہ میں شور و غل مچ گیا۔ لڑکے حشرات الارض کی طرح منتشر ہو گئے۔ ہر طرف دھول دھپّا اور دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔ اُس نے اُس کو چپت رسید کی اُس نے اُس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر زمین پر چت کر دیا اُس نے اس کو منہ چڑھا دیا۔ اُس نے اس کو مغلظات سُنا دیں، غرضکہ دو گھنٹہ کے لئے مدرسہ میں چھٹی کیا ہوئی کہ لڑکوں نے مدرسہ کی زمین سر پر اُٹھا لی اور قیامت مچا دی۔

دوپہر کی چھٹی میں روز لڑکے عموماً اپنے اپنے گھر جایا کرتے تھے اور دو گھنٹہ آرام کر کے پھر مدرسہ میں حاضر ہوتے تھے لیکن آج بہت سے لڑکے مدرسہ کے احاطہ سے باہر پختہ سڑک کے

کنارے آم کے درختوں کے سایہ میں رُک گئے اور ایک تازہ موضوع پر جو اُن کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

بات یہ تھی کہ آج مدرسہ میں ایک نئے لڑکے کا داخلہ ہوا تھا، جس کا نام ظفر محمد تھا اور جس کا نام سب پہلے سے جانتے تھے اگرچہ کسی کی اب تک دید شنید اُس سے نہ تھی۔ ظفر محمد قرب و جوار میں "سلمہ کا لڑکا" کہلاتا تھا۔ اس کی ماں سلمہ کو لوگ قابل ملامت عورت سمجھتے تھے اور اس سے کسی قسم کی راہ و رسم نہیں رکھتے تھے لڑکوں نے بھی اپنے ماں باپ کے وتیرے اختیار کر لئے تھے اور سلمہ اور ظفر محمد کو اپنے سے فروتر اور حقیر سمجھتے تھے ظفر محمد اپنے گھر سے باہر بہت کم نکلنے پاتا تھا، اسی لئے گاؤں کے لڑکوں میں کوئی اس کا جلیس و رفیق نہ تھا۔ آج پہلے پہل وہ گھر سے اتنی دور بھیجا گیا تھا اور اس کو دوسرے لڑکوں سے سابقہ پڑا تھا۔ بیچارہ بھیگی بلی کی طرح سہما اور سمٹا ہوا ایک کونہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ مدرسہ کے لڑکے اُس سے اجنبیت اور بیگانگی برت رہے ہیں۔ جب چھٹی کا گھنٹہ بجا تو سب لڑکے پھرتی کے ساتھ چھلانگیں مارتے ہوئے درجوں سے نکلے مگر غریب ظفر محمد کی ہمت نہ پڑی کہ سب کے ساتھ وہ بھی کھیل کود میں

شریک ہو۔ اس لئے وہ سب کے بعد درجہ سے نکلا اور سب سے پیچھے رہ گیا۔

سڑک کے کنارے جو لڑکے جمع ہوئے تھے وہ اپنے ہمجولی زکریاؔ کے کہنے سے جمع ہوئے تھے اور اُس کی باتوں کو بڑی حیرت سے سُن رہے تھے۔ زکریاؔ قسمیں کھا کھا کر کہہ رہا تھا۔

"میں خوب جانتا ہوں میں نے اپنی ماں کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ ظفرؔ محمد کا کوئی باپ نہیں ہے"۔

یہ بات کسی لڑکے کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا؟۔

ایک لڑکے نے کہا۔ "تو اس کا باپ مر گیا ہوگا"۔

"نہیں" زکریاؔ نے جواب دیا۔ "اس کے کبھی کوئی باپ نہیں تھا وہ بے باپ کے پیدا ہی ہوا ہے"۔

اب تک بعض لڑکوں نے صرف حضرت عیسیٰؑ کو سُنا تھا کہ بے باپ کے پیدا ہوئے ہیں اور اُن کی تو دنیا اسقدر تعظیم کرتی ہے، وہ پیغمبر تھے لیکن ظفرؔ محمد بھی بے باپ کے پیدا ہوا ہے اور اُس کی ماں سے اُن کے ماں باپ نفرت کرتے ہیں اور اُس کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے لڑکوں کو بھی تعلیم دی تھی کہ ظفرؔ محمد کو اپنے سے کم مرتبہ سمجھو اور لڑکے بے چون وچرا ایسا ہی سمجھ رہے تھے۔ آخر یہ کیوں؟

یہ حجت وتکرار ہو رہی تھی کہ سُلمہ کا لڑکا بھی سڑک پر آنکلا اور

اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ اس کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ صورت اچھی تھی مگر صحت کچھ خراب سی معلوم ہوتی تھی، وہ نسبتاً اور لڑکوں سے زیادہ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا لیکن اُس کے چہرہ اور چال سے ہراس اور بزدلی ٹپک رہی تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ سب لڑکے اس کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

ظفر ابھی اپنے گھر کی طرف مڑنے بھی نہ پایا تھا کہ لڑکوں کا جارحانہ مذاق شروع ہوا اور وہ "بے باپ کا"، "بے باپ کا" چلاتے ہوئے اُس کے پیچھے دوڑے۔ ظفر تیزی کے ساتھ قدم اُٹھانے لگا مگر اسکے شریر اور موذی ہم مکتبوں نے اسے آگھیرا اور اس سے پوچھنے لگے۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

"ظفر" نے جواب دیا۔ "ظفر"

"اور باپ کا نام؟" زکریا نے پوچھا۔

ظفر حیرت اور سراسیمگی کے عالم میں چپ چاپ کھڑا سب کا منھ تک رہا تھا۔ اُس نے کبھی اس سوال پر غور ہی نہیں کیا تھا اُسنے کبھی اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا اور نہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی باپ ضرور ہوتا ہے۔ ماں کا نہ ہونا اُس کے لئے اچنبھے کی بات ضرور تھی لیکن باپ کا نہ ہونا اُسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور اس کے

نزدیک باپ کا نہ ہونا کوئی ایسی بات نہ تھی کہ جس پر تعجب کیا جائے۔
جب لڑکوں نے دیکھا کہ ظفر سے کچھ کہتے نہیں بن پڑتا تو سب
تالیاں بجا بجا کر کہنے لگے " باپ ہو تو باپ کا نام بتایا جائے لیکن
جب باپ ہی نہ ہو تو کوئی نام کہاں سے گڑھے"۔
ظفر اتنا پریشان ہوا کہ اُس نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔ "ہاں
میرے بھی باپ ہے"۔ فوراً اِدھر طرف سے سوال ہونے لگا:۔
"کہاں ہے؟ کیا نام ہے؟ کیا کرتا ہے؟"
اس شورش میں زکریا کی آواز بہت بلند تھی۔ ظفر سے کچھ نہ بن پڑا
تو زکریا سے مخاطب ہو کر کہا:۔
"اگر میرے باپ نہیں ہے تو تم لوگوں کے بھی باپ نہیں ہیں"۔
زکریا نے تن کر پندار کے ساتھ کہا۔ "سب کے باپ ہوتے ہیں
میرے باپ کا نام ایوب خاں ہے اور وہ مر گیا"۔
سب نے زکریا کی ہاں میں ہاں ملائی۔ گویا باپ کا مر جانا، باپ کے
نہ ہونے سے زیادہ اچھی بات سمجھی گئی اور پھر یہ لڑکے صرف اس
بنا پر اپنے کو ظفر سے بلند و برتر سمجھتے تھے کہ وہ باپ والے تھے
حالانکہ ان میں سے اکثروں کے باپ بدترین خلائق تھے بہتیرے
تو ایسے تھے جو نکمے تھے اور اپنی بیویوں کو جا و بیجا مار اپیٹا کرتے تھے

اور ایسے باپوں پر اُن کے بیٹوں کو ناز تھا اور ظفر ستائے جانے کا صرف اس لئے مستحق تھا کہ اُسکے کوئی باپ نہ تھا ظفر نے اپنی جان بچانے کے لئے کہا۔ "تو میرا باپ بھی مر گیا ہوگا"۔

اس پر بڑا قہقہہ لگا۔ سب ایک زبان ہو کر کہنے لگے۔ "نہیں نہیں تمھارے کوئی باپ ہی نہیں"۔

یہ کہتے ہوئے سب حلقہ باندھ کر ظفر کے گرد ناچنے اور اُچھلنے کودنے لگے۔

بلّی بھی جب عاجز ہو جاتی ہے تو شیر کی آنکھوں پر چنگل مارتی ہے بالکل یہی حال ظفر کا تھا، لڑکوں نے اس کو اتنا عاجز کر دیا کہ اب اس کو مدافعانہ حملہ کرنا پڑا، کوئی اُس کو منھ چڑھا رہا تھا، کوئی اُدھر سے ایک چپت لگا رہا تھا کوئی ادھر سے۔ ظفر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے آخر کار زکریا کی چپت کے جواب میں اُس نے ایک ڈھیلا کھینچکر مارا جو دوسرے لڑکے کو لگا۔ بس کیا تھا۔ سب ظفر پر ٹوٹ پڑے اور اس کو اتنا مارا کہ کئی جگہ اُس کا جسم پھوٹ گیا اور وہ بے دم ہو کر گر پڑا اور اسپر بھی بیدرد اور ظالم لڑکے اس کو نہ چھوڑتے، خیریت یہ ہوئی کہ مدرس کو اس واقعہ کی خبر لگ گئی وہ آپہونچا اور جتنے لڑکے اس جگہ موجود تھے ان سب کو خوب پیٹا۔ ظفر کا ہاتھ منھ دُھلایا گیا۔ مدرس نے اس سے

حالات دریافت کئے مگر مارے ڈر کے بیچارے کی زبان سے کچھ نہ نکلا۔ مدرس نے اپنے سامنے ظفر کو اسکے گھر کی طرف روانہ کیا۔

(۳)

خستہ و رنجور ظفر مارے درد کے روتا اور لڑکھڑاتا ہوا چلا آ رہا تھا اسکو اپنی چوٹ کا کچھ زیادہ احساس نہیں تھا۔ اس کو سب سے زیادہ ملال یہ تھا کہ اس کے کوئی باپ نہیں ہے اور اگر ہے تو وہ اس کو نہیں جانتا، وہ خود اپنی نگاہ میں خوار و حقیر معلوم ہو رہا تھا، حالانکہ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ باپ کا ہونا یا نہ ہونا کون سی بڑی بات ہے۔ لیکن آج سب نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ دنیا میں باپ کا ہونا ضروری ہے اور جس کے باپ نہیں وہ بدترین خلائق ہے مگر اب وہ باپ کہاں سے لائے؟ اس کو مدرس اعلیٰ کے تیور سے بھی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی اس کو ذلیل و خوار سمجھ رہا تھا، اگرچہ اس نے اس کی طرفداری کی تھی اور لڑکوں کے غول سے اسکی جان بچائی تھی مگر یہ تو اس نے صرف اپنا فرض ادا کیا تھا۔

ظفر دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا، وہ فطرتاً بہت حساس تھا اور ذرا ذرا سی بات سے اس کو سخت صدمہ پہنچ جاتا تھا اور اُس کی ماں کی افسردگی اور پژمردگی نے اسکو اور بھی سریع الحس بنا دیا تھا اُس نے آج تک اپنی ماں کا چہرہ ہنستا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ ماں نے

اس کو یہ سمجھا دیا تھا کہ دنیا ہنسنے اور خوش ہونے کی جگہ نہیں ہے اور اس جگہ جو کچھ ہوتا ہے وہ صرف ہم کو ملول اور رنجیدہ کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ وہ یوں بھی زندگی کو ایک دُکھ سمجھ رہا تھا، حالانکہ ابھی اسکی عمر صرف کھیلنے اور ہنسنے ہنسانے کی تھی۔

آج ظفر پہلی بار دنیا میں ملا تھا اور پہلی ہی بار دنیا اُس کے ساتھ اس طرح پیش آئی۔ ظفر کا سارا حوصلۂ زندگی چند گھنٹوں میں پست ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کو مبہم اور غیر واضح طور پر یہ معلوم ہو گیا تھا کہ دنیا سے وہ کیا اُمیدیں لگا سکتا ہے اور زندگی سے اُس کو کیا پھل مل سکتا ہے۔ اسکا ننھا سا دل آج ذراسی بات میں ڈوبنے لگا تھا۔ اسی طرح گرتا پڑتا وہ اس پختہ پوکھرے کے پاس پہنچ گیا جو جمال پور اور احمد پور کے درمیان واقع تھا۔ پوکھرے کے کنارے ظفر دم لینے کے لئے رُک گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کو زندگی ایک مصیبت معلوم ہو رہی تھی اور وہ زندگی سے بیزار ہو رہا تھا، اُس کا کسی طرح گھر لوٹ کر جانے کو جی نہیں اُبھرتا تھا، اتنے میں اُسکو یاد آیا کہ اب سے چند ماہ پہلے وہ ایک بار اسی پوکھرہ کے کنارے ایک شور سُن کر دوڑا ہوا آیا تھا اور دیکھا تھا کہ لوگ عزیز کی لاش کو اس پوکھرے سے نکال کر باہر لے آئے ہیں اور اسی پر ایک ہنگامہ برپا ہے۔ عزیز ایک تنگ دست اور مفلوک الحال کسان تھا جس کو کبھی

پیٹ بھر کھانا نہیں میسّر ہوتا تھا، اُس نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا اور دل ہی دل میں اپنی قسمت کو کوس کوس کر افلاس کی جانگسل مصیبت کو برداشت کرتا رہا، ایک بیوی تھی دو چھوٹے چھوٹے بچّے تھے اور پریشاں روزگاری تھی اُس پر بھی عزیز کے چہرے پر شکن نہ تھی لیکن کھوٹی قسمت سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا، فاقہ اور ناداری کی مار تو تھی ہی اُس پر سے عزیز کی جان پر یہ ستم توڑا گیا کہ اُس کی بیوی اچانک ایک دن بیمار ہوئی اور دوسرے دن مر گئی، اب معصوم اور کمسن بچّوں کی دیکھ بھال بھی عزیز کے سر آپڑی، اب بھی عزیز صبر و شکر کئے بیٹھا رہا کچھ دنوں کے بعد گاؤں میں وبا پھیلی جس میں سب سے پہلے اس کے دونوں بچّے موت کی بھینٹ چڑھے۔ بیچارے کا دماغ ٹل گیا اسی کے دوسرے دن گاؤں والوں نے اُس کی لاش پوکھرے میں پائی۔

دنیا والوں کی ہمدردی ہمارے ساتھ اس وقت شروع ہوتی ہے جب کہ اُن کی ہمدردی نہ ہمارے کام آسکتی ہے اور نہ ہم کو اسکی ضرورت ہی ہوتی ہے۔ جب تک عزیز زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا اُس وقت کسی نے اُس سے کبھی اتنا بھی نہ پوچھا کہ "کہو بھائی کیسے بسر بسر ہوتی ہے" آج جبکہ وہ مر گیا تو ہر شخص کا دل اُسکی موت پر دکھ رہا تھا۔ اور جسے دیکھو اُسکی یاد میں ٹھنڈی سانسیں بھر رہا تھا۔ ظفر کو خوب یاد تھا

لوگ کہتے تھے کہ عزیز بڑا خوش نصیب تھا جو تمام مصیبتوں سے نجات پا گیا۔ ظفر لوگوں کے اس کہنے پر غور کر رہا تھا۔ کیا واقعی اس طرح ڈوب کر آدمی ہر طرح کی مصیبتوں سے نجات پا جاتا ہے؟ پھر کیا وجہ کہ وہ خود بھی اسی طرح مصیبت سے نجات نہ حاصل کر لے؟

بچوں کا دل کسی مسئلہ پر زیادہ دیر تک جرح و تعدیل نہیں کرتا اور زیادہ دور تک آگا پیچھا نہیں سوچتا۔ ظفر کو یقین تھا کہ موت انسان کو ہر مصیبت سے بچا لیتی ہے۔ اُس نے اس سے آگے اس بات پر غور نہیں کیا اور جھم سے پوکھرے میں کود پڑا۔

(۳)

"کیوں بچے! تم پوکھرے میں کیوں کود پڑے تھے؟"

جب ظفر ہوش میں آ گیا تو اُس کے بچانے والے نے پوچھا۔

"میں ڈوب کر مرنا چاہتا تھا اس لئے کہ میرا کوئی باپ نہیں ہے تم نے مجھے کیوں بچایا؟" ظفر نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا اور اپنے کپڑے نچوڑتا رہا۔ اُس آدمی نے جس نے ظفر کو پوکھرے سے نکالا تھا اور جس کا نام محسن تھا ایک ٹھنڈی سانس لی جس میں درد بھرا تھا اور گہرے سوچ میں پڑ گیا۔

ظفر نے پھر کہا "آج مدرسہ میں سب لڑکوں نے مجھے صرف اسلئے

مل کر مارا کہ میرے کوئی باپ نہیں ہے۔ میں اب پھر مدرسہ لوٹ کر نہیں جاؤں گا اور نہ گھر جاؤں گا"۔

ظفر کے حلق میں سسکیوں سے آواز پھنس رہی تھی اور وہ رُک رُک کر باتیں کر رہا تھا۔

محسن نے کہا "نہیں تم میرے ساتھ اپنے گھر چلو۔ وہاں چل کر تم کو بتا دوں گا کہ تمہارا باپ کون ہے"؟

ظفر محسن کا منھ تکنے لگا۔ محسن کی ہمدردی میں اُس نے خلوص پایا اور چپ چاپ اُس کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ محسن راستہ بھر ایک عجیب ادھیڑ بن میں مبتلا تھا وہ بہت سی باتوں پر غور کر رہا تھا اور خیالات کے ایک طوفان میں گم تھا۔

گھر پہنچکر سیدھا جھونپڑی کے اندر گیا اور محسن سے کہہ گیا۔ "تم باہر کھڑے رہو"۔

ظفر نے رو رو کر ماں سے سارا قصہ بیان کر دیا اور پوچھا "اماں مجھے بتا دو کہ میرا باپ کون ہے؟ کہاں ہے؟ کیا کرتا ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ سب کے باپ ہوتے ہیں اور اگر تم نہیں بتاؤ گی تو باہر جو آدمی کھڑا ہے میں اس سے پوچھ لوں گا۔ وہ جانتا ہے کہ میرا باپ کون ہے اور مجھے بتانے کا وعدہ کیا ہے"۔

سلمہ کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور یہ سُرخی انتہائی غیرت اور شرم کی سُرخی تھی۔ اُس نے ظفر کو چھاتی سے لپٹا لیا اور اُس کے دل میں ایسا تلاطم برپا ہوگیا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ آج اس کی آنکھوں کے سامنے اب سے نو برس پہلے سے لے کر اب تک کا زمانہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے اس دور کو ایک مقدس راز بنا رکھا تھا۔ دنیا نے اس کو کیسا کیسا مجبور کیا، اپنے بیگانے نے اسکو کیسا کیسا ستایا، ماں باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا۔ برادری والوں نے اس کو اپنی برادری سے خارج کر دیا سلمہ نے یہ سب کچھ برداشت کر لیا مگر اپنے ساتھ اپنے تباہ کرنے والے کو رسوا نہیں کیا۔ اس کی رسوائی کو وہ اپنی بیحرمتی سمجھتی تھی، دوسروں کو نہ معلوم ہونا تھا نہ معلوم ہوا کہ سلمہ کو کس نے بھگایا اور ظفر کس کی پشت سے ہے۔ ہر طرف کی طعن و تشنیع اور ہر شخص کی انگشت نمائی سے پناہ پانے کے لئے اس نے گاؤں سے بہت دور ایک چھوٹی سی جھونپڑی ڈال کر بود و باش اختیار کر لینا چاہا لیکن کوئی زمیندار اس کو اپنی زمین میں بسانے کے لئے تیار نہ تھا۔ صرف ایک خدا کا بندہ ایسا تھا جس نے اُسکی حالت پر ترس کھایا اور اس کو اپنی زمین میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی ڈال لینے کی اجازت دے دی۔ یہ سب مصیبتیں سلمہ پر سے گزر گئیں مگر اُس نے اپنے راز کو

افشا نہ ہونے دیا۔ وہ خود اچھی طرح ذلیل و رسوا ہو چکی تھی اگر دوسرے کا راز پردے میں رہ گیا ہے تو کیا ضرورت ہے کہ وہ اسکو ظاہر کر کے دوسرے کو بھی رُسوا کرے۔ اس نے تن تنہا ساری دنیا کا تو مقابلہ کیا لیکن اب اس کا کیا علاج کہ ظفر اس راز کو جاننے پر تلا ہوا تھا۔ ظفر اپنے ہمسنوں سے کہیں زیادہ تیز اور ذکی الحس تھا اور اسکو بہلائے رکھنا آسان نہیں تھا۔ آج ظفر نے جو کچھ کیا تھا اُسکا خیال کر کے سلمہ کانپ جاتی تھی۔

ظفر نے پھر اصرار کیا۔ "اماں! میرا باپ کون ہے؟ تم بتاؤ نہیں تو میں اس آدمی سے پوچھتا ہوں"۔

سلمہ نے کہا۔ "اچھا تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا باپ کون ہے؟ مگر چلو ذرا مجھے اس آدمی کو دکھاؤ تو جس نے تمہاری جان بچائی ہے"۔

ظفر سلمہ کو باہر لے آیا اور محسن کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔ سلمہ چونک پڑی، یہ تو وہی محسن تھا جو اُس کے راز سے اچھی طرح واقف تھا اور جو آڑے وقت میں اُس کے کام آیا تھا۔ سلمہ کچھ سراسیمہ سی ہو گئی۔ محسن گرد و نواح کے بہت بڑے زمینداروں میں سے تھا اُس نے خدا سے ڈر کر اس کو اپنی زمین میں بسنے کی اجازت دیدی تھی؛ آج اگر محسن نہ ہوتا تو شاید سلمہ کو بے خانماں رہنا پڑتا۔

سلمہ ابھی اپنی گھبراہٹ کو دور کرنے نہیں پائی تھی کہ محسن نے کہا "تم ذرا اپنے لڑکے کی طرف سے ہوشیار رہو۔ وہ اور لڑکوں کی طرح بے شعور اور بے حس نہیں ہے۔ اگر اُس کا یہی حال رہا تو ایک دن تم کو اُس کی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ وہ اب یہ جانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کا باپ کون ہے؟ تم کو اب اس کے اور دنیا کے اس سوال کا جواب دینا ہے۔ سلمہ! مجھے خوب معلوم ہے کہ تم کو کس نے تباہ و برباد کر دیا۔ میں نے بہت چاہا کہ تمہاری مدد کروں اور تم کو اس ذلت اور پستی سے نجات دلا دوں مگر میری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ میں نے خلیل بھائی کو بہت سمجھایا اور اُن کو بڑی غیرت دلائی کہ وہ واقعہ کا اعلان کر کے تمہارے ساتھ شادی کر لیں مگر خدا نہ کرے کوئی اس طرح رسم و رواج کا بندہ ہو۔ پٹھان اور سید کا جو فرق تھا وہ تھا ہی اس پر طرّہ یہ کہ خلیل بھائی سجادہ نشین ہیں اور شاہ صاحب کہلاتے ہیں۔ انکو اپنی کاکلوں اور داڑھی کی لاج بھی رکھنا تھی

میں ان کو بے حمیت اور نامرد سمجھتا ہوں۔ انکا فرض یہ تھا کہ وہ بہادری اور مردانگی کے ساتھ اپنی لغزش کا سب کے سامنے اعتراف کر کے تم کو اپنی پناہ میں لے لیتے مگر ان میں اتنی ہمت کہاں تھی۔ خیر اب جو کچھ ہوا سو ہوا۔ لیکن میں تم سے کہے جاتا ہوں کہ اب اسکا وقت آگیا ہے

کہ ظفر کو تمام باتیں بتا دو۔ وہ بڑا نازک دل رکھتا ہے اور طبیعت کا بڈھا ہے، اگر اب تم نے اس سے اس راز کو چھپایا تو اُس کی جان سے ہاتھ دھو رکھو۔"

سلمہ نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک آہ کی اور کہا۔" میں قسم کھا چکی ہوں کہ مرتے دم تک یہ راز کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ اب بھی میری یہی آن ہے اور اسی میں عزت ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی میری آن اور میری عزت کا پاس کریں گے اور بغیر میری رائے لئے ہوئے کسی کو اصل واقعہ نہیں بتائیں گے، آپ کے بھائی کو دنیا معصوم اور پارسا سمجھ رہی ہے اور انھوں نے دنیا کو یہی سمجھا رکھا ہے وہ بڑے گھر کے لڑکے ہیں، دین اور دنیا دونوں میں وہ سُرخرو ہیں۔ میں اُن کو نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ میں اپنے کو اُن کی لونڈی سمجھتی ہوں۔ یہی سمجھ کر میں نے ظفر کو اتنا بڑا کیا۔ اُنھوں نے بہت چاہا کہ درپردہ میری مدد کریں اور میرا اور ظفر کا خرچ چلائیں۔ مگر میں نے اس کو منظور نہیں کیا۔ پشتہا پشت سے آپ کے خاندان میں یہ رواج ہے کہ ایک آدمی سجادہ نشین بنتا ہے اور فقیری کی موروثی گدّی اسی کو سونپی جاتی ہے۔ مگر یا اللہ کیا اس نسل میں خلیل میاں ہی اسکے لئے تھے؟ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ "تمھارے ساتھ شادی

ضرور کروں گا“ لیکن آخر کار اُن کی ہمت نہ پڑی اور اسکی وجہ یہی تھی کہ سب کی نگاہ میں وہ شاہ صاحب تھے لیکن نہیں دنیا میں کبھی دولت اور عزت کے لحاظ سے وہ مجھ سے کیا کم اونچے ہیں۔ وہ میرے ساتھ شادی کرتے تو کیسے کرتے؟ مجھ میں اور اُن میں نسبت ہی کیا تھی؟ لیکن پھر ان کو مجھے یوں برباد بھی نہ کرنا چاہیئے تھا مگر جیسا کہ آپ نے کہا اب تو جو ہوا سو ہوا۔ ظفر کو اب مجھے بہلانا ہے۔ میں ابھی تک اس معاملہ میں صرف چپ سادھے رہی ہوں، جھوٹ بولنے کی نوبت نہیں آئی ہے، اب جھوٹ بھی بولوں گی اور ظفر کو بہلانے کے لئے اُس کے باپ کا کوئی نام بتا دوں گی“۔

ظفر چُپ چاپ کھڑا اپنی ماں اور محسن کی گفتگو کو سُنتا رہا۔ مگر اُسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اُس نے محسن سے پوچھا۔ ”بتاؤ میرے باپ کا کیا نام ہے؟ تم نے وعدہ کیا ہے“۔

محسن نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔ ”میں تمھارا باپ ہوں، اور اب اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ میرے باپ کا نام محسن ہے“۔

ظفر دوڑ کر محسن سے لپٹ گیا اور بڑی دیر تک اُس سے لپٹا رہا۔ اس کے بعد وہ کھیلنے کودنے چلا گیا۔ سلمہ تھوڑی دیر تک محسن کا منھ تکتی رہی۔ محسن نے کہا۔ ”سلمہ! آج مجھے ظفر کو بتانا تھا کہ اُس کے باپ کا

کیا نام ہے اور جب تم تلی ہوئی ہو کہ اس کو سچ بات کبھی نہ بتاؤ گی تو میں نے اپنا ہی نام بتا دیا۔ کسی طرح اس غریب کی تسکین ہو جائے

۴

دوسرے دن ظفر مدرسہ پہنچا تو لڑکوں نے پھر اس کو پریشان کرنا شروع کیا۔ لیکن آج ظفر نے تن کر فاتحانہ انداز میں کہا۔

"میرے بھی باپ ہے اور اُس کا نام محسن ہے"۔

"کون محسن؟" ہر طرف سے سوال ہونے لگا۔

"وہی جو روز کھیتوں میں مزدوروں سے کام لیتا ہے آج بھی وہ اس پوکھرے کے پاس کھیت میں کام کرا رہا ہے"۔ ظفر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"جھوٹ!" سب نے متفق اور ایک آواز ہو کر جواب دیا۔ "وہ تو بہت بڑا زمیندار ہے۔ ہمارے باپ دادا سب اس سے ڈرتے ہیں اور اُس کا لحاظ کرتے ہیں وہ تمہارا باپ کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہاری ماں ایک نیچ ذات کی غریب عورت ہے اور وہ امیر ہے۔ اور پھر تمہاری ماں کی شادی اُس کے ساتھ نہیں ہوئی وہ تمہارا باپ کیسے ہوا؟"

ظفر پھر آبدیدہ ہونے لگا۔ سب نے اُس کو خاموش دیکھ کر پھر چڑھانا شروع کیا۔ "بے باپ کا! بے باپ کا!!"

ظفر وہاں سے روتا ہوا بھاگ نکلا اور سیدھا محسن کے پاس پہنچا محسن نے اس کو روتا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

"کہو اب کیا ہوا؟"

"وہ سب تو کہتے ہیں کہ تم میرے باپ نہیں ہو۔ اس لئے کہ میری ماں کی شادی تمہارے ساتھ نہیں ہوئی ہے"۔

یہ کہہ کر ظفر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ محسن اب سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنے لگا اور تھوڑی دیر تک ظفر کو کوئی جواب نہیں دیا۔ ظفر اسی طرح روتا رہا۔ اتنے میں محسن کے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں پیدا ہوا تھا، وہ چونک پڑا۔ اُس کے چہرہ سے اطمینان اور مسرت کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ اُس نے ظفر سے کہا۔

"اچھا اسوقت تم گھر جاؤ۔ میں تم کو یہ بھی بتا دوں گا مگر ابھی نہیں تم اب مدرسہ نہ جاؤ اور جبتک میں نہ کہوں تم مدرسہ نہ جانا۔" ظفر نے یہی کیا۔

محسن جانتا تھا کہ اس معاملہ میں وہ خلیل سے کوئی امید نہیں رکھ سکتا۔ خلیل محسن کے چچا کا لڑکا تھا اور اُس کا ہمسر زمیندار تھا، اور پھر دنیا میں اپنے زہد و اتقا کی بھی ساکھ رکھتا تھا، لوگ اس کی چوکھٹ پر دعا تعویذ کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ ان سب باتوں نے اس کو

مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی کمزوریوں کو چھپائے اور اپنے عیوب کو پردے میں رکھے۔ محسن عمر میں خلیل سے چھوٹا تھا اور اسکا کوئی بس نہیں چل سکتا تھا۔ تاہم اُس نے خلیل کو سمجھانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا۔ خلیل نے پہلے تو اُس کی باتوں پر دھیان نہیں دیا مگر جب دیکھا کہ محسن بُری طرح اُس کے پیچھے پڑ گیا ہے تو جھلاّ گیا اور یہ کہہ کر قصہ ختم کر دیا۔ "میرا معاملہ ہے۔ تم اپنا کام دیکھو۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے حق میں کیا بہتر ہے اور مجھ کو کیا کرنا چاہیئے۔"

محسن نے اس کے جواب میں صرف اتنا اور کہا تھا۔ "خیر! یہ تو غلط ہے، یہ اکیلے تمھارا معاملہ نہیں ہے، بلکہ ایک اور بیچاری کا بھی معاملہ ہے جس کو تم نے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا۔"

اس کے بعد اس موضوع پر محسن اور خلیل کے درمیان کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ آج بھی پہلے اُس نے سوچا کہ ایک بار پھر جا کر خلیل کے ضمیر کو اُبھارے لیکن خلیل کے تیور اور اُس کی روش کو یاد کر کے اس کی ہمت نہیں پڑی، یکایک اس کو اس مسئلہ کا دوسرا حل سوجھا لیکن یہ معمولی جراءت کا کام نہ تھا۔ محسن بھر دن اپنے کو تولتا رہا، دنیا اس کو کیا کہے گی؟ وہ اپنے ماں باپ اور دوست احباب کو کیا منھ دکھائے گا؟ مگر اب تو جو کچھ بھی ہو وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا۔

۵

کام سے فرصت پاکر محسن سیدھا سلمہ کے پاس پہنچا۔ سلمہ نے اُس کو دیکھتے ہی کہا۔ "آپ نے ظفر کو مدرسہ جانے سے کیوں منع کردیا ہے اور آپ اس طرح بے تکلف ہو کر میرے پاس کیوں آتے ہیں؟ ایک تو میں یوں بھی اس قابل نہیں کہ آپ میرے پاس آئیں اور میری بات پوچھیں۔ دوسرے میں دنیا کی نگاہ میں کس قدر ذلیل و خوار ہوں، آپ مجھ سے مل کر خود اپنے کو کیوں ذلیل کرتے ہیں؟"

محسن نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "آج میں قسم کھاکر چلا ہوں کہ تمہاری مصیبتوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردوں"۔

سلمہ نے طنز کے ساتھ مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تو اسکی صرف ایک صورت ہے"۔

محسن نے سلمہ کا مطلب سمجھ کر جواب دیا۔ "مگر میں نے دوسری صورت سوچی ہے"۔

سلمہ سراپا سوال بن کر محسن کی صورت دیکھنے لگی۔ محسن نے کہا۔ "میں قسم کھا چکا ہوں کہ تمہارے ساتھ شادی کرونگا اور ظفر کو اور دنیا کو یہ سمجھاؤں گا کہ میں نے تم کو تباہ و برباد کیا تھا اور میں ظفر کا باپ ہوں فضول مجھ سے اختلاف نہ کرو اور کوئی عذر نہ کرو۔ میں ٹھان چکا ہوں۔

ہاں میں اپنے ماں باپ سب سے تمہارے لئے لڑوں گا۔ میں اس کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا کار ثواب سمجھتا ہوں۔ میری عاقبت صرف اس لئے بن جائے گی کہ میں نے تمہارے ساتھ شادی کی اور ظفر کا باپ ہوا، اور اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا اور میرے ساتھ شادی نہ کی تو پھر جس بات کو تم نے اس احتیاط اور وفاداری کے ساتھ راز رکھا ہے اُسکو میں فاش کر دوں گا، میں دنیا کو اور ظفر کو یہ بتا کر رہوں گا کہ ظفر کا باپ کون ہے؟

محسن کے لہجہ میں جوش تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ جو کچھ وہ کہہ چکا ہے اُس کو کر کے رہے گا۔

سلمہ دیر تک بُت بنی محسن کو دیکھتی رہی۔ اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا بک رہا ہے اور وہ خود اس کا کیا جواب دے۔

محسن نے پھر کہا۔ ”سلمہ! تم اس کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں ایک ہفتہ کے اندر تم سے شادی کرنے والا ہوں“۔

”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ سلمہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا۔ ”اگر یہ ممکن ہوتا تو خلیل میاں بھی یہی کر سکتے تھے“۔

خیر! اس سے بحث نہیں کہ خلیل یہ کر سکتے تھے یا نہیں۔ مگر میں یہ کر سکتا ہوں اور کروں گا۔“ محسن نے کہا۔

سلمہ کو جب یہ یقین ہو گیا کہ محسن ہوش و حواس اور سنجیدگی کے ساتھ یہ کہہ رہا ہے تو وہ اُس کے قدموں پر گر پڑی اور رو کر کہنے لگی۔

”آپ نے مجھ پر یہی کیا کم احسان کیا ہے کہ مجھے اپنے گانوں میں رہنے دیا۔ میں آپ کے اس احسان کو عمر بھر نہیں بھول سکتی۔ لیکن اب آپ کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ یہ بات تو کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی۔

محسن نے سلمہ کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا اور کہا۔ ”ایک ہفتہ میں تم میری بیوی ہو گی، اس کے بعد سے ظفر مدرسہ جانا شروع کرے گا اور اگر تم نے اس سے اختلاف کیا تو ممکن ہے اسکا انجام وہ ہو جس کو تم کسی طرح برداشت نہ کر سکو۔“

(۶)

ایک ہفتہ بعد ہر طرف شور مچ گیا کہ سلمہ کا بہکانے والا محسن تھا، اور آخر کار اپنے ضمیر کی ملامت سے مجبور ہو کر اُس نے سلمہ سے شادی کر لی ہے۔ محسن نے ہر طرف یہی مشہور کیا۔ گانوں والوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ اپنے بیگانے اُس پر آوازے کسنے لگے۔ لیکن محسن نے کسی سے کبھی نظر نیچی نہیں کی۔ اس نے سب سے آنکھیں ملا کر اس جرم کا اقرار کیا جس کا وہ کبھی مرتکب نہیں ہوا تھا۔

شادی کے دوسرے ہی دن محسن نے ظفر کو مدرسہ بھیجا اور سمجھا دیا کہ "اب سب سے کہہ دو۔ میں تمہارا باپ ہوں اور تمہاری ماں کی شادی میرے ساتھ ہوئی۔ اب اگر کوئی تم کو چھیڑے گا تو اُس کی خیریت نہیں ہے" اور اُسکے بعد ظفر کو کسی نے نہیں چھیڑا۔ سب اس سے ڈرنے لگے تھے استاد اس کی عزت کرنے لگے تھے، اس لئے کہ وہ محسن کا لڑکا تھا، جو اطراف و جوانب میں ایک بہت بڑا زمیندار تھا۔

خلیل نے اس کے بعد کبھی محسن سے آنکھیں برابر کر کے باتیں نہیں کیں۔ شاید اُس کو معلوم ہو گیا کہ وہ اس قابل نہیں کہ محسن سے آنکھیں ملا سکے۔ مگر دنیا اب بھی خلیل کو معصوم اور پرہیزگار سمجھ رہی ہے اور اس کے ساتھ وہی حسن ارادت رکھتی ہے۔

۳۱ ۱۹ سنہ ء

تمام شد



